Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1967

سچّے موتی

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ناجائز کمائی میں سے صدقہ اور خیرات کرنے والے کی خیرات خدا کے ہاں کبھی قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اس کمائی کو اپنے اوپر خرچ کرتا ہے تو اس میں خیر و برکت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اسے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو وہ اس کے لئے جہنم کا توشہ بن جاتی ہے۔ یاد رکھو! ایک خرابی کا ازالہ دوسری خرابی سے نہیں ہو سکتا۔ برائی تو اچھائی کے ذریعے ہی مٹ سکتی ہے۔ جو خود ناپاک ہے وہ ناپاک کو پاک کیسے کر دے گا؟

(صاحب مصابیح السنۃ فی الصحاح)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

طلوع اسلام

ہزاروں کی تعداد
میں چھپتا ہے ۔

اور جس رفتار سے یہ ملک میں مقبول ہو رہا ہے ، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی اشاعت کتنی تیزی سے اور بڑھے گی ۔ نیز اس کا ایک ایک پرچہ تعلیمی اداروں ، لائبریریوں اور دفاتر میں کئی کئی افراد پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ پاکستان اور بیرونی ممالک کے نہایت بلند پایہ طبقہ میں ہوتا ہے ۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ :

طلوع اسلام میں اشتہار دینے سے

آپ کے کاروبار کو کس قدر پبلسٹی مل سکتی ہے ۔ اشتہارات کے نرخ حسب ذیل ہیں :-

ٹائٹل	ایک بار	سال بھر کا ٹھیکہ	
صفحہ نمبر ۲ ، ۳	۱۷۵ روپے	۱۵۰ روپے	(فی اشاعت)
صفحہ نمبر ۴	۲۰۰ روپے	۱۷۵ روپے	,,
اندرونی صفحات			
پورا صفحہ	۱۲۰ روپے	۱۰۰ روپے	,,
نصف صفحہ	۷۰ روپے	۶۰ روپے	,,

اجرت اشتہار مسودہ کے ساتھ پیشگی آنی چاہئے ۔ اگر کسی اشتہار کا بلاک بنوانا مقصود ہو تو بلاک کی اجرت الگ لی جائے گی ۔ غیر مہذب اشتہارات شائع نہیں کئے جائیں گے ۔

ناظم
ادارہ طلوع اسلام
۲۵- بی گلبرگ ، لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدل اشتراک
سالانہ پاکستان ـــــ دس روپے
سالانہ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے
سالانہ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان	ہندوستان
ایک روپیہ	ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی گلبرگ لاہور

جلد ۲۰
مارچ ۱۹۶۷ء
نمبر ۳

فہرست مضامین

۱۔ لمعات		۲
۲۔ قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	(محترم پرویز صاحب)	۲۵
۳۔ رابطہ باہمی		۵۶
۴۔ چین کا عالمی کردار	(محترم خورشید عالم صاحب)	۵۷
۵۔ رویت ہلال کا اطمینان بخش انتظام		۶۵
۶۔ ایسا کیوں ہے۔ (صدر محترم کی خدمت میں)		۷۱
۷۔ باب المراسلات	(دعا کی قوت) (جنت ماں کے قدموں کے نیچے)	۷۵

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" کے پردے میں!

گذشتہ عید پر رویت ہلال کے سلسلہ میں جو مختلف بحثیں منظرِ عام پر آئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ اسلام میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے اس لئے جن لوگوں نے حکومت کے اس فیصلے کے خلاف (کہ عید جمعرات کو ہوگی) اعلانات کئے اور جمعہ کو عید کرائی، انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل تھا۔ انہیں ایسا کرنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اسلام کا حکم یہ ہے کہ ۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ۔ دین میں کوئی اکراہ (زبردستی) نہیں۔ اگر بات صرف اس ہنگامہ خیزی کے جواز اور عدم جواز تک رہتی، تو بھی خیر تھی لیکن چونکہ اسے ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور اس کی سند میں قرآن کریم کی ایک آیت کا ٹکڑا بھی پیش کر دیا گیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس اصولی نکتہ کا پوری طرح جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اسلام کی رُو سے "مذہبی آزادی" کی حیثیت کیا ہے اور اس کے دوائر کون سے۔ یہ اس لئے بھی اشد ضروری ہے کہ اس سوال کا تعلق مطالبۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان، اور خود (ہندوستان سے الگ ہو کر) مملکتِ پاکستان کے جواز و عدم جواز کے بنیادی سوال سے ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہندو (اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت) کی طرف سے یہ کہا جاتا تھا کہ اسلام کا مطالبہ لا اکراہ فی الدین کا ہے۔ یعنی مذہبی معاملات میں زبردستی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہم (یعنی حکومتِ ہند) مسلمانوں کو مذہبی آزادی کی پوری پوری ضمانت دیتے ہیں۔ اس سے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ پھر اسلام کے نام پر ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ ۔۔ چہ معنی دارد؟ آپ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ مطالبۂ پاکستان اور اس کی مخالفت کی ساری بحث اس ایک محور کے گرد گردش کرتی نظر آئے گی۔ ظاہر ہے کہ جب ہندوؤں کی طرف سے اس ضمانت کے باوجود (کہ مشترکہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو پوری پوری مذہبی

آزادی حاصل ہوگی) ہم بار بار دہراتے تھے کہ اس سے اسلام کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہی میں پورا ہو سکتا ہے ۔۔۔ تو اس کا مطلب واضح ہے کہ مطالبۂ پاکستان پیش کرنے والوں کے نزدیک "مذہبی آزادی اور پابندی" کا مفہوم کچھ اور تھا۔ اور یہی وہ مفہوم تھا جو مطالبۂ پاکستان کی وجۂ جواز اور حصولِ پاکستان کی بنیاد تھا۔ اب اگر ہم اسے تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو اگر "مذہبی آزادی" حاصل ہو جائے (یعنی کوئی مملکت اِن لوگوں کے تصور کے مطابق، لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، کے اصول کو تسلیم کر لے) تو پھر اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے، تو پھر مملکت پاکستان کے جداگانہ وجود کی (اسلامی نقطۂ نگاہ سے) کوئی وجۂ جواز ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر ہندوؤں کا اکھنڈ بھارت کا مطالبہ اسلام کے خلاف نہیں قرار پا سکتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ بات (کہ ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل ہونی چاہیئے) بظاہر کسقدر معصوم و سادہ نظر آتی ہے لیکن درحقیقت کسقدر گہری اور بنیادی ہے۔ اور مملکتِ پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے کسقدر دور رس تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے! یہ وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ اس سوال کا بڑی دقتِ نظر سے جائزہ لینا اشد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی مملکت کی اس سے زیادہ بدبختی کوئی اور ہو نہیں سکتی کہ اس کے وجود (EXISTENCE) کی وجۂ جواز (JUSTIFICATION) کے متعلق افراد مملکت کا ذہن صاف نہ ہو، اور اس میں (شعوری یا غیر شعوری طور پر) ایسے خیالات ابھرتے رہیں، جو اس مملکت کی وجۂ جواز کی بنیادوں کو ہلا دیں۔ مملکتِ پاکستان میں یہی ہو رہا ہے۔ یہاں کے باشندوں (بالخصوص ہماری ابھرنے والی نسلوں) کے ذہن میں یہ بات صاف طور پر موجود نہیں (یا یوں کہیئے کہ ان کا اس پر ایمان نہیں) کہ ایک آزاد مملکت کا وجود اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ اپنی آزاد مملکت کے بغیر کوئی شخص اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ مطالبۂ پاکستان، اسلام کے اسی بنیادی تقاضے کا مظہر تھا اور مملکتِ پاکستان کا وجود اسی تقاضا کو پورا کرنے کا ذریعہ۔ اگر (خدانہ کردہ) یہ مملکت باقی نہ رہے تو ہمارے لئے اسلامی زندگی بسر کرنے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ غیر مسلموں کی مملکت میں ۔۔۔ خواہ وہ جمہوری انداز کی سیکولر مملکت ہی کیوں نہ ہو، ۔۔۔ کوئی شخص اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا خواہ اسے پوری پوری "مذہبی آزادی" بھی حاصل کیوں نہ ہو۔ پاکستان کا وجود اور ہمارے اسلامی نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان لازم و ملزوم ہیں۔

اس قسم کے خیالات ابھرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم دین اور مذہب میں فرق نہیں کرتے۔ ہم نے اسلام کو بھی دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب (RELIGION) سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس خوش بختی پر بحضور ربّ العزت سجدہ ریز ہے کہ اُس نے اسے یہ توفیق عطا فرمائی کہ اس نے دین اور مذہب کے فرق کو (جسے اور تو اور خود مسلمانوں نے بھی صدیوں سے فراموش

کر رکھا تھا) نمایاں طور پر پیش کیا، اور اس حقیقت کو باصرار و تکرار دہرایا کہ مذہب، ایک فرد کا پرائیویٹ معاملہ ہے، لیکن دین، ایک ضابطۂ حیات، ایک نظامِ زندگی ہے جو اسلامی سوسائٹی کے اندر برومند ہوتا ہے اور جس کی عملی تشکیل کے لئے اپنی آزاد مملکت کی ضرورت لابدی ہے۔ مومن، اس اسلامی مملکت کا شہری (CITIZEN) ہوتا ہے۔ یہ سوسائٹی (جماعت مومنین) کس طرح متشکل ہوتی ہے اور یہ مملکت کیسے وجود میں آتی ہے، اسے قرآن کریم نے ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ کے بنیادی نقطہ سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ خدا نے (اپنے آخری نبیؐ کی وساطت سے) ایک ضابطۂ حیات (قرآن کریم) عطا کیا۔ اور انسانوں سے کہہ دیا کہ ہم اس ضابطہ کو کسی سے بالجبر منوانا نہیں چاہتے۔ تم اس پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرو، عقل و بینش کی روشنی میں اسے دیکھو، تاریخی شواہد اور مطالعہ فطرت کی تائیدات سے اسے پرکھو۔ اور اس کے بعد اگر تم، قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے، اس نتیجہ پر پہنچو کہ یہ واقعی مبنی بر صداقت ہے، تو اسے بطور ضابطۂ حیات قبول کرو اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن جاؤ، جو اس ضابطہ کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے (اور جس کے سب سے پہلے ممبر خود رسولِ اکرمؐ تھے)۔ لہٰذا، مسلم سوسائٹی یا اسلامی مملکت ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے جو قرآن کی صداقتوں پر علی وجہ البصیرت، بلاجبر و اکراہ، ایمان لائے، اور انہیں اپنی زندگی کا ضابطہ بنا لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس کے لئے کہا کہ ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ اس سوسائٹی کا ممبر بننے (دین قبول کرنے) میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ اس لئے کہ ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۔ (۲/۲۵۶) ۔ قرآن کے آنے سے صحیح اور غلط راستے واضح اور متمیز ہو چکے ہیں۔ جو سا راستہ جس کا جی چاہے اختیار کر لے ۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ ۔ وَ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (۱۸/۲۹)، اے رسولؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ ایک منزل تباہی کی ہے ایک سلامتی کی۔ جو جونسا راستہ اختیار کرے گا، اس منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح دنیا میں دو سوسائٹیاں وجود میں آ گئیں۔ ایک ان لوگوں کی جنہوں نے حق کا راستہ اختیار کر لیا، دوسرے ان کی جنہوں نے قرآن کے علاوہ کوئی اور راستہ منتخب کیا۔ اور انہی دو سوسائٹیوں کی نسبت سے، دنیا میں مملکتوں کی بھی دو قسمیں قرار پا گئیں ۔ ایک مملکت وہ جس میں قرآن کی حکمرانی ہو ۔ اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں ۔ اور دوسری وہ جس میں انسانوں کے خودساختہ (غیر خداوندی) قوانین کی کارفرمائی ہو۔ یہ غیر مسلم مملکت کہلائے گی۔

اب آپ ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ آپ دنیا کی کسی سوسائٹی کو لیجئے۔ اس میں اس بات کی تو

آزادی ہوگی کہ جس کا جی چاہے اس کا ممبر بنے اور جس کا جی چاہے ممبر نہ بنے لیکن جو شخص اس کا ممبر بنے اسے اس کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ اس کا جی چاہے تو اس سوسائٹی کے قواعد وضوابط کی پابندی کرے اور جی چاہے تو ان کی پابندی نہ کرے۔ یا ان قواعد وضوابط میں سے جس قاعدہ اور ضابطہ کی جی چاہے پابندی کرے اور جس سے جی چاہے انحراف کرے۔ اس کی اجازت کسی ممبر کو نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح کوئی سوسائٹی قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ جو شخص ان قواعد وضوابط کی پابندی نہیں کرنا چاہتا، اس سے کہا جائے گا کہ تم اس کی رکنیت سے مستعفی ہو جاؤ۔

بعینہٖ یہی پوزیشن اسلامی سوسائٹی کی ہے۔ اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے لئے تو کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن جو شخص بطیبِ خاطر اس کا ممبر بنتا ہے، اسے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اس سوسائٹی (یعنی مملکت اسلامی) کے جن احکام وقوانین کی جی چاہے اطاعت کرے اور جن کی جی چاہے خلاف ورزی کرتا رہے۔ ان احکام وقوانین میں "مذہبی" اور "غیر مذہبی" کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔ (مذہب کا تو لفظ تک قرآن میں نہیں آیا۔ یہ سب دین کے احکام ہوتے ہیں جن کا ماننا ہر مسلم کا فریضہ ہوتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ان احکام وقوانین کی اطاعت اس کے لئے مشکل ہے، اس کے سامنے یہ راستہ کھلا ہے کہ وہ جب جی چاہے اس سوسائٹی کی ممبرشپ سے مستعفی ہو کر غیر مسلم بن جائے۔ اس کا اس سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ جس طرح دین میں داخل ہونے پر کوئی زبردستی نہیں تھی، اسی طرح دین کو چھوڑ دینے پر بھی کوئی زبردستی نہیں ـــ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ـــ لیکن دین میں رہتے ہوئے، اس کے (یعنی اسلامی مملکت) کے فیصلوں کی خلاف ورزی یہ کہہ کر نہیں کی جا سکتی کہ ـــ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ـــ اس "آزادی" کا یہ مفہوم ہی نہیں۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ..... (۳۳/۳۶)

کسی مومن مرد یا مومن عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ جب کسی معاملہ میں خدا اور اس کا رسول کوئی فیصلہ دے دے تو پھر وہ اس میں اپنی مرضی اور اختیار کو دخل دیں۔ (اس میں پھر کسی فرد کے لئے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔)

جو ایسے فیصلوں کی خلاف ورزی کرے وہ مجرم قرار پائے گا اور جو یہ کہے کہ میں "خدا اور رسولؐ" کے اس حق (اتھارٹی) کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ مومن ہی نہیں رہتا۔ اس سوسائٹی کی ممبرشپ سے خارج ہو جاتا ہے (۵/۴۴)

[واضح رہے کہ قرآن کریم میں "خدا ورسولؐ" کی اطاعت سے مراد اس اسلامی مملکت کی اطاعت ہے، جو

قوانینِ خداوندی کی حکمرانی کے لئے قائم ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کی اتھارٹی کیجگہ اپنی اتھارٹی منوانا چاہتا ہے، تو یہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے جس کی سزا موت ہے۔ (۵/۳۳)

اسلامی مملکت کے متعلق اس وقت تک جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے کم از کم یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ

(۱) اس میں "مذہبی امور" کا کوئی سوال ہی نہیں ہوگا۔ اور

(۲) جب مذہبی امور ہی نہ ہوں گے تو مذہبی پیشوائیت کا وجود بھی نہیں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قرنِ اوّل (عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ) میں الگ مذہبی پیشوائیت کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا۔

اس مملکت میں، ہر وہ معاملہ جسے مملکت اپنے دائرہ اقتدار میں لے لے، دینی ہو جاتا ہے۔ اور مملکت ہی کی طرف سے اس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے جس کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہوتی ہے۔ اس میں "مفتی" اور "قاضی" عمالِ حکومت ہوتے ہیں۔ انہیں آجکل کی اصطلاح میں حکومت کے لیگل ایڈوائزر (مشیرِ قانون) یا جج کہا جائے گا۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت میں ایک مسلم فرد کو کس حد تک آزادی حاصل ہوگی؟ اس ضمن میں سب سے پہلے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جن امور کو مملکت اپنے دائرہ اقتدار میں لے کر فیصلے نافذ کرے گی ان میں افراد کو خلاف ورزی کی آزادی نہیں رہے گی۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مملکت کے دائرہ اقتدار کے لئے بھی اصولی راہ نمائی دے دی ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں۔ اسلامی مملکت ان اشیاء کے استعمال کو قانوناً ناجائز قرار دے گی۔ لیکن جن چیزوں کے استعمال کو قرآن نے حلال قرار دیا ہے ان کے متعلق افراد کو اپنے انتخاب اور حسنِ ذوق کی آزادی حاصل ہوگی ـــــ اور یہ دائرہ بڑا وسیع ہے ـــــ مملکت، کسی ہنگامی ضرورت یا مصلحت کے پیشِ نظر کسی حلال چیز کے استعمال پر کوئی عارضی پابندی عاید کرے تو وہ اور بات ہے۔ جیسے آجکل ہفتہ میں دو دن گوشت کا ناغہ کرایا جاتا ہے یا ہیضہ کی وبائی صورت میں امرود، کھیرے وغیرہ پر پابندی لگا دی جاتی ہے ـــ لیکن عام حالات میں انفرادی پسند کا دائرہ بڑا وسیع ہوتا ہے۔

اس مملکت میں افراد کو فکری آزادی حاصل ہوگی۔ مثلاً جن حقائق کو قرآن کریم نے اصولی طور پر ـــ یا تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کیا ہے اور ان کا کوئی متعین مفہوم خود ہی بیان نہیں کر دیا۔ ہر شخص انہیں اپنی اپنی فکر و بصیرت کے مطابق سمجھنے کا مجاز ہوگا۔ اسے اس فکر کے اظہار کی بھی آزادی ہوگی لیکن وہ اسے کسی دوسرے پر ٹھونسنے کا حقدار نہیں ہوگا۔ یہ اختلافِ فکر و نظر علمی اور اکادمی سطح پر رہیگا۔

اس سے اختلاف فی العمل کی گنجائش پیدا نہیں کی جا سکتی، کیونکہ امت کی عملی وحدت دین کا بنیادی تقاضا فلہذا، اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے اور ہر وہ رجحان و اقدام جو امت میں تفرقہ اور انتشار پیدا کرے قرآن کی رُو سے شرک، فلہذا، روک دینے کے لائق ہے۔

یہاں سے ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر اسلامی مملکت کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ دیتی ہے۔ اور ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ حکومت کا فیصلہ، اس کی بصیرت کے مطابق خلافِ اسلام ہے۔ تو ایسی صورت میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی؟ ظاہر ہے کہ جب تک وہ فیصلہ موجود رہے گا، اس کی اطاعت لازم، اور اس کی خلاف ورزی بہرحال جرم ہوگی۔ یہی ہیں وہ مقامات جن کے متعلق ہمیں اس قسم کے ارشاداتِ نبویؐ ملتے ہیں کہ

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص اپنے حاکم کی طرف سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اس کو ناگوار ہو تو صبر کرے۔ اس لئے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی جدا ہوا اور وہ اسی حال میں مر گیا۔ تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

یا یہ کہ:

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص تم پر حاکم بنایا جائے اور تم اس کے کسی ایسے فعل کو دیکھو جو خدا کی نافرمانی پر مبنی ہے، تو تم اس کے اس فعل کو برا سمجھو اور اسکی اطاعت سے دستبردار نہ ہو۔ (مسلم۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

اور اس کی عملی مثال ہمارے ہاں کی تاریخ میں امت کے پہلے اختلاف کے وقت ملتی ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا پروگرام بنایا تو صحابہؓ نے اس سے اختلاف کیا۔ لیکن اس کے باوجود حضرت صدیقؓ اپنے فیصلہ پر قائم رہے اور جنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ تو جن صحابہؓ کی رائے ان کے خلاف تھی، انہوں نے جنگ کی کارروائی میں شرکت سے انکار نہیں کیا۔ وہ بھی آپ کی معیت میں اس میں شریک تھے۔ حضرت صدیقؓ نے اپنے موقف کی وضاحت کی تھی اور اس پر بعض صحابہؓ مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ لیکن جو ایسے نہیں تھے انہوں نے بھی آپ کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ مشورہ کے وقت کسی تجویز سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن جب مملکت اس کے متعلق فیصلہ کر لے تو آپ پر اس فیصلہ کی پابندی لازم آجائے گی خواہ وہ فیصلہ آپکی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مملکت کا فیصلہ خلافِ شریعت ہے تو اس کی اطاعت سے کیا ہم خدا کے ہاں گنہگار نہیں ہوں گے؟ تو اول تو انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت

کہتے ہی اسلامی مملکت کے فیصلوں کو ہیں۔ اس لئے اگر اس کا کوئی فیصلہ ایسا ہے جسے آپ اپنی بصیرت کے مطابق صحیح نہیں سمجھتے تو اس کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی نہ کہ آپ پر۔ لیکن بایں ہمہ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے اتباع سے آپ گنہگار ہوں گے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی مخالفت سے آپ امت میں جو تفرقہ اور انتشار پیدا کریں گے تو اس کے لئے آپ خدا کے فیصلہ کے مطابق مشرک قرار پائیں گے۔ (دیکھئے ــ ۳۰/۳۰۰۳) سوچئے کہ ان دونوں میں سے کونسا جرم زیادہ سنگین ہے؟

لیکن اس کے ساتھ ہی، اسلامی مملکت کے آئین میں اس قسم کی شق بھی موجود ہوگی۔ کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ مملکت کا فلاں فیصلہ منشائے خداوندی کے مطابق نہیں، تو اس کی ترمیم و تنسیخ کے لئے کس قسم کے آئینی اقدامات کئے جائیں۔ یہ جو ہم اپنی تاریخ میں اس قسم کی روایات دیکھتے ہیں کہ جس وقت تم اپنے کسی حاکم کو غلط راستے کی طرف مڑتا ہوا دیکھو تو اُسے سیدھا کردو' تو وہ اسی قسم کے آئینی اقدامات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو اس کی اجازت ہے کہ وہ مملکت کے جس فیصلے کو خلافِ شریعت' سمجھے، اپنے طور پر اس کی مخالفت کرنی شروع کردے اور حکومت سے کہے کہ آؤ مجھ سے مناظرہ کرلو۔ جو جیت جائے اس کا فیصلہ واجب الاطاعت ہوگا۔ ایسا کرنا، مملکت کے اندر، حکومت کے مقابلہ میں ایک متوازی حکومت قائم کرنے کے مرادف ہوگا۔ سوچئے! کہ اس طرح دنیا کی کوئی حکومت چار دن تک بھی چل سکتی ہے؟ ذرا سامنے لائیے اس منظر کو کہ حکومت نے غنیم کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاد کا اعلان کیا۔ دوسری طرف' مولوی صاحبان فقہ و حدیث کی کتابیں کھول کر بیٹھ گئے کہ یہ جنگ جہاد نہیں، بلکہ فساد لڑائی ہے۔ لہذا، اس میں شرکت و تعاون گناہِ عظیم ہے۔ حکومت ان سے مناظرہ کرتی رہے اور دشمن اتنے میں ملک کا صفایا کرجائے! یاد رکھیئے! کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم اور فقیہہ کیوں نہ ہو، اسلامی مملکت میں' اختلافی معاملات میں' اس کی حیثیت وکیل (اپنے موقف کے حق میں دلائل دینے والے) کی ہو سکتی ہے، جج (فیصلہ کرنے والے) کی نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ آخری حکومت کی طرف ہی سے صادر ہوگا۔ اور جب تک وہ فیصلہ موجود رہے گا اُس پر بھی' دیگر افرادِ مملکت کی طرح' اس کی اطاعت لازم ہوگی۔ کسی عالم عالم یا فقیہہ کا تو ذکر کیا، امت کے فقیہہ اعظم امام ابو حنیفہؒ کا یہ واقعہ کسے یاد نہیں کہ آپ قاضی شہر کے غلط فیصلوں کے خلاف اپنے طور پر اظہار رائے فرمایا کرتے تھے۔ گورنر نے آپ کو اس سے روک دیا تو آپ وہیں رک گئے۔ اور اس حکم کی تعمیل اس حد تک کی کہ ایک دن آپ کی بیٹی نے مسئلہ پوچھا کہ میں روزہ سے ہوں۔ دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے نیچے اُتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی رہا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ جانِ پدر! اپنے بھائی حماد سے پوچھو۔ میں فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہوں۔ (سیرۃ النعمان۔ مولانا شبلی ص ۹۳) ــ اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک تقویٰ و پاکیزگی یا علومِ شریعت

میں بلند نگہی کا تعلق ہے، کوفہ کے گورنر کو امام اعظمؒ سے کیا نسبت ہو سکتی تھی۔ لیکن وہاں سوال اس گورنر کی ذات کا نہیں تھا، نمائندۂ مملکت کے فیصلہ کی اطاعت کا سوال تھا ـــــ اور مملکت بھی خلافتِ راشدہ کی نہیں تھی بس مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس پر بھی ان حضرات کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا ـــــ اور ایسا ہونا ہی چاہیئے ورنہ اگر ہر شخص اس دعوے کے ساتھ کہ مجھے شریعت کا زیادہ علم ہے، جج بن کر بیٹھ جائے تو نظامِ حکومت قائم کیسے رہ سکتا ہے؟

اب سوال یہ رہ جاتا ہے اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو کس حد تک آزادی حاصل ہوگی۔ سو اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ انہیں "مذہبی آزادی" حاصل ہوگی۔ ان کے لئے مذہب کا لفظ بولنا بالکل ٹھیک ہے ان کے ہاں ہوتا ہی مذہب ہے۔ انہیں پوجا پاٹ کی اجازت ہوگی، عام مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہوگی۔ انہیں اپنے باہمی معاملات کو اپنے ہاں کے رواج کے مطابق طے کر لینے کی اجازت ہوگی۔ لیکن جن امور کے متعلق مملکت ایسے قوانین نافذ کرے جن کا اطلاق مملکت کے تمام شہریوں پر ہوتا ہے، ان میں انہیں آزادی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً قتلِ نفس (کسی جان کا ناحق تلف کر دینا) مملکت کے قانون کے مطابق جرم ہو اور مملکت میں کوئی ایسا قبیلہ بستا ہو جو بتوں کے استھان پر اپنے بچوں کا خون چڑھانا مذہباً جائز سمجھتا ہو، تو انہیں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کے برعکس اسلام میں بھتیجی کے ساتھ نکاح حرام ہے لیکن اگر مملکت میں کوئی ایسے غیر مسلم بستے ہوں جن کے ہاں یہ رشتہ مذہباً جائز ہوں تو انہیں اسکی اجازت ہوگی۔

ہم نے ان امور کا تذکرہ محض تمثیلاً کر دیا ہے۔ اس سے ان امور کی تفصیلی فہرست مرتب کرنا مقصود نہیں جن کی غیر مسلموں کو آزادی ہوگی۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے ہاں کے غیر مسلم باشندوں سے ان امور کی فہرست طلب کرے جنہیں وہ "امورِ مذہب" سمجھتے ہیں۔ اور اس کے بعد انہیں بتا دے کہ ان میں سے فلاں فلاں معاملہ کا تعلق امورِ مملکت سے ہے۔ اس لئے ان میں انہیں ملک کے عام قانون کی پیروی کرنی ہوگی۔ باقی امور میں انہیں آزادی ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں تک خالصتہً "مذہبی آزادی" کا تعلق ہے۔ اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے مقابلہ میں، غیر مسلموں کو زیادہ آزادی حاصل ہوگی۔ اسلئے کہ مسلمانوں کے لئے مذہبی اور غیر مذہبی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ان کے ہاں جو کچھ دین کی ذیل میں آتا ہے اس کے لئے مملکت کے قوانین کی پابندی دینی فریضہ ہوگی۔

اس وقت تک ہم نے جس قدر گفتگو کی ہے وہ "اسلامی مملکت" کے متعلق ہے ۔ اور اسے پھر سن رکھیئے کہ مسلمانوں کی مملکت اور اسلامی مملکت میں بڑا فرق ہے۔ ہر اسلامی مملکت مسلمانوں کی مملکت ہوگی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ مسلمانوں کی ہر مملکت اسلامی مملکت ہو۔ اسلامی مملکت اُسے کہتے ہیں جس میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی حکمرانی ہو۔ اس معیار کے مطابق اس وقت دنیا میں کوئی مملکت بھی اسلامی نہیں ۔ محض مسلمانوں کی حکومتیں ہیں ۔ ان مملکتوں میں، پاکستان کی حیثیت اس اعتبار سے متمیز ہے کہ یہ حاصل بھی اسی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اور اس کا ابھی تک یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنے گی ۔ اور یہ ایسی مملکت بن بھی جاتی اگر مذہبی پیشوائیت اس کے راستے میں حائل نہ ہوتی۔ آپ شاید اس پر متعجب ہوں کہ ہم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس کے اسلامی مملکت بننے کے راستے میں مذہبی پیشوائیت حائل ہے۔ کیونکہ مذہبی پیشوائیت کا تو دعویٰ یہ ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لئے مصروفِ جدوجہد ہے۔ لیکن دین سے ان کی مراد مذہب ہے۔ یہاں اٹھارہ برس سے دین اور مذہب میں مسلسل جنگ ہو رہی ہے۔ یہ بات ذرا غور سے سننے کے قابل ہے۔

ہمارا مروجہ اسلام اُس دور کا پیدا کردہ ہے جب اسلامی مملکت ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تھی۔ ملوکیت نے دین اور مذہب میں وہ ثنویت پیدا کی جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس ثنویت کی رُو سے، ان بادشاہوں نے امورِ دنیا تو اپنے پاس رکھ لئے اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ ۔ عقاید، عبادات اور نکاح و طلاق وغیرہ سے متعلق "پرسنل لاز" وغیرہ ۔ اُس دائرے میں بادشاہ کی حکومت تھی، اِس احاطہ میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ۔ اب پاکستان میں مذہبی پیشوائیت یا تو سارے کے سارے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے کر یہاں تھیاکریسی قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو، تو پھر اس ثنویت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے جس کی رُو سے "مذہبی معاملات" میں آخری فیصلہ ان کا تسلیم کیا جائے، اور حکومت ان کے فیصلے کو قانوناً رائج کرنے کی ایجنسی بن کر رہ جائے۔ آپ ذرا اس پر غور کیجئے کہ اس وقت ملک میں بے شمار ایسی خرابیاں عام ہو رہی ہیں جو اسلام کے صریحاً خلاف ہیں ۔ مثلاً رشوت، بلیک مارکیٹنگ، چیزوں میں آمیزش وغیرہ۔ آپ نے کبھی نہیں سنا دیکھا ہوگا کہ علمائے کرام رحتے کہ اسلامی جماعت نے ان میں سے کسی کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔ لیکن جب حکومت نے عائلی قوانین نافذ کئے تو سارے ملک میں ہنگامہ برپا کر دیا گیا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ ان حضرات کے اسلام کے تصور کے مطابق، رشوت، بلیک مارکیٹنگ وغیرہ دنیاوی امور ہیں جن کا تعلق حکومت سے ہے۔ اور عائلی مسائل وہ ہیں جو علماء کے حیطۂ اقتدار میں آتے ہیں، اس لئے ان میں دخل اندازی کا حکومت کو کوئی حق نہیں ۔ اسی طرح، حکومت، یومِ پاکستان، یومِ آزادی وغیرہ تقاریب کا تعین جس طرح جی چاہے کرے، مذہبی پیشوائیت

کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا لیکن عید کے چاند کا تعین علماء کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ مذہبی معاملہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات کس طرح اس ثنویت کو قائم رکھنے کے لئے جنوں فروش ہیں جو دین کی عین ضد ہے۔ اور اس کا نام رکھا جاتا ہے "اقامتِ دین کے لئے جہاد"۔ اور یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ اگر یہاں صحیح قرآنی مملکت قائم ہوگئی تو اس میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔

اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس وقت، جبکہ یہاں ہنوز صحیح قرآنی مملکت قائم نہیں ہوئی، حکومت کے فیصلوں کی پابندی اور خلاف ورزی کی کیا پوزیشن ہے۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم اس سوال تک پہنچیں، آپ یہ دیکھیں کہ خود مُلّا لوگوں کو کس قدر مذہبی آزادی دیتا ہے؟ اس کے ہاں "مذہبی آزادی" کا یہ عالم ہے کہ اگر آپ قرآن کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم بیان کریں جو مُلّا کے نزدیک قابلِ قبول نہیں تو وہ آپ پر جھٹ سے کفر و الحاد کا فتوےٰ لگا دے گا۔ قرآن کریم نے، بجز چند احکام دین کے صرف اصول دیئے ہیں اور انہیں حدود اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، تمدنی زندگی کے مختلف گوشوں میں مسلمان کو اپنے ذوق کی تسکین اور حسنِ انتخاب کی پوری پوری آزادی ہے لیکن مُلّا کی شریعت میں قدم قدم پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں ـــ کھاؤ پیو اس طرح، چلے پھرو یوں، اٹھو بیٹھو اس انداز سے، رہو سہو اس قاعدے کے مطابق، نہاؤ یوں، دانت اس طرح صاف کرو، کپڑے اس طرح کے پہنو ـــ غرضیکہ زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گوشہ بھی ایسا نہیں جہاں فرد کو آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ان کی مرضی کے مطابق اٹھتا بیٹھتا نہیں تو اسکے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔

خود ان کی باہمی تکفیر و تفسیق کا یہ عالم ہے کہ ان کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس نے دوسرے فرقوں پر کفر کے فتوے نہ لگائے ہوں۔ ان کے ہاں، اہلحدیث کی مسجد میں کوئی حنفی نماز نہیں پڑھ سکتا اور حنفیوں کی مسجد میں کوئی اہل حدیث قدم نہیں رکھ سکتا۔ خود حنفیوں میں، بریلوی، دیوبندیوں کو گمراہ قرار دیتے ہیں اور دیوبندی، بریلویوں کو باطل پرست۔ کسی حنفی کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ نماز میں آمین بلند آواز سے کہے۔ اور کوئی اہل حدیث اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ان کی جماعت کا کوئی فرد ناف پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے۔ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ میرا تعلق ان میں سے کسی فرقہ سے نہیں، میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں، تو یہ تمام فرقے متحد ہو کر اسے مرتد قرار دے دیتے ہیں ـــ اس وقت تو اُسے مرتد قرار دینے سے اس کا اسکے سوا کچھ نہیں بگڑتا کہ وہ معاشرہ میں بدنام ہو جاتا ہے لیکن اگر (خدانخواستہ) اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا۔ ہماری ساری تاریخ اس قسم کی "مقدس" خونریزی سے لالہ زار بن رہی ہے۔

یہ تو عام مُلّا کی حالت ہے۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کو لیجئے جو "مذہبی آزادی" کے لئے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ کیا ان کے تصور کی اسلامی مملکت میں، امور مذہبی اور دنیاوی امور یا پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی تفریق ہوگی؟ "دین و دنیا" کی تفریق کے متعلق مودودی صاحب اپنی کتاب تفہیمات (حصہ دوم) میں لکھتے ہیں:-

ایک اور چیز جس کا ہماری عبادتوں کو ضعیف الاثر بنانے میں بڑا حصہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا غلط تخیل ہے۔ یہ دراصل جاہلیت کا اعتقاد تھا جس کو اسلام نے بالکل مٹا دیا تھا مگر نہ معلوم اس نے مسلمانوں میں کیسے راہ پالی۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دین انسانی زندگی کے شعبوں میں سے محض ایک شعبہ ہے جس کا دوسرے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہبی رسوم، عبادات اور قربانیاں محض اس لئے ضروری ہیں کہ خدا یا دیوتاؤں کو خوش کیا جائے اور زندگی کے معاملات میں ان کی تائید حاصل کی جائے۔ ان فرائض کو انجام دیکر جب انسان عبادت گاہوں سے باہر نکلے تو مذہب کی طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور وہ مختار ہوتا ہے کہ اپنی دنیا کے معاملات جس ڈھنگ پر چاہے چلائے۔ اسلام نے اس غلط حد بندی کو مٹایا۔ دین کو زندگی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا نظام اعمل قرار دیا۔ عقائد اور اخلاق کے درمیان، ایمان اور سیرت کے درمیان، عبادات اور معاملات کے درمیان، مذہبی اعمال اور دنیوی اعمال کے درمیان ایک گہرا ربط قائم کیا۔ اور انسان کی دنیوی زندگی ہی کو بالکلیہ دینی زندگی بنا دیا۔ اس نے بتایا کہ دین اس دنیا کے معاملات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اسی دنیا کے کاروبار میں اللہ کے قانون کی پیروی اور اسکے مقرر کئے ہوئے حدود کی پابندی، اور اس کی رضا کے اتباع کا نام دین ہے۔ عبادات اور معاملات دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، بلکہ معاملات ہی میں حدود اللہ کی پابندی اور خوشنودیٔ الٰہی کی طلب۔ اور تقرب الی اللہ کی سعی کا نام عبادت ہے۔ (صفحہ ۱۸۳-۱۸۲)

اسلامک اسٹیٹ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

اس قسم کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کُلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اسکے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں

کہہ سکتا کہ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ (اسلام کا نظریۂ سیاسی)

ان کے اس قسم کے اسٹیٹ کے قائم ہو جانے کے بعد موجودہ مسلمانوں کا کیا بنے گا۔ اسکے متعلق بھی سن لیجئے کہ اسکا آپ کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائیگی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر، ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے۔ اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔

(مرتد کی سزا۔ صفحہ ۸۰)

اس ضمن میں اسے بھی پیش نظر رکھیئے کہ "اسلام" کے معنی ہوں گے وہ طریقہ جسے یہ حضرات "اسلامی" قرار دیں۔ اس کے بعد آپ خود سمجھ لیجئے کہ جب حکومت ان کے ہاتھ میں آئے گی تو لوگوں کو کسقدر مذہبی آزادی حاصل ہوگی! حقیقت یہ ہے کہ مُلّا کے پیکر کا خمیر ہی نفرت اور خوف سے مرکب ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیت مسلمانوں کے مُلّا ہی کی نہیں، دنیا کے ہر مذہب کے "ملا" کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ نفسیات (سائیکالوجی) کی رو سے ایک خاص ذہنیت ہوتی ہے جسے (SADISTIC) کہتے ہیں۔ اس ذہنیت کا حامل دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا مزاج ہی اس ذہنیت (SADISM) سے مرتب ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں دوسروں کو اپنے ہاتھوں سے عذاب دیتا یا دلواتا ہے — اگر اس کے پاس قوت ہوتی ہے تو دوسروں کو جسمانی عذاب دیتا ہے۔ اگر قوت نہیں ہوتی تو انہیں کافر، فاسق، فاجر، مرتد، ملحد، بے دین قسم کی گالیوں سے قلبی اذیت پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ منبر پر کھڑا ہو کر

دوسروں کو دھمکاتا ہے کہ تم دیکھنا، قبر میں منکر نکیر کس طرح گرزوں سے تمہاری ہڈیاں توڑتے ہیں اور جہنم میں کس طرح تمہاری چربی پگھلتی ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہے گا کہ قبر میں میرا یہ حشر ہوگا اور جہنم میں مجھے یہ عذاب ملے گا وہ ہمیشہ یہی کہے گا کہ تمہارے ساتھ یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ جب اس کے پاس قوت نہیں ہوتی تو وہ یہ کچھ صرف زبانی کہتا ہے۔ اور جب قوت ہاتھ میں آجاتی ہے تو پھر یہی کچھ خود کر کے دکھاتا ہے۔ اور (اپنے آپ کو اس فریب میں رکھ کر یا دوسروں کو فریب دے کر کہ اس سے میں دین کی بڑی خدمت کر رہا ہوں) بہت خوش ہوتا ہے۔ اسی کو (SADISM) کہتے ہیں۔ سو جب قوت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو وہاں کسی آزادی کا کیا سوال ــــ وہاں ہر شخص پر ہر وقت خوف مسلط رہے گا۔ "اُس وقت" کی بات تو چھوڑیئے۔ آپ اِس وقت (جبکہ ان کے ہاتھ میں کوئی قانونی اقتدار نہیں) ان کی طرف سے مسلط کردہ خوف کا اندازہ لگایئے آج ہماری آبادی کے کم از کم نوے فیصد لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ کمرے کے اندر بیٹھے ملّا کو گالیاں دیتے ہیں، لیکن اُن میں سے کسی کو جرأت نہیں پڑتی کہ جو کچھ کمرے کے اندر بیٹھا کہہ رہا ہے اسے برسرِ عام بھی دہرا دے۔ ملّا دوسروں کو اعلانیہ گالیاں دیتا ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ معاشرہ میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ فساد برپا کرواتا ہے۔ لیکن کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ اس کی زبان پکڑے یا ہاتھ روکے۔ اگر کوئی کچھ کہتا بھی ہے تو اس طرح ڈرتے، سہمے، جھجکتے، لجاتے، جیسے کوئی بہت بڑا گناہ کر رہا ہو۔ آپ سوچئے کہ جب عدم اقتدار کے زمانے میں مُلّا کے خوف کا یہ عالم ہے تو اس کے اقتدار کے وقت لوگوں کی حالت کیا ہوگی؟ اور انہیں کس حد تک آزادی نصیب ہوگی؟

اس کے بعد اس سوال کی طرف آیئے کہ بحالاتِ موجودہ، حکومتِ پاکستان کے فیصلوں کی نوعیت کیا ہے اور ان کی پابندی اور خلاف ورزی کی صورت میں پوزیشن کیا؟

اس سلسلہ میں، ہم تمہیداً اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے اور ہماری آنے والی نسلوں نے بہرحال اس ملک میں رہنا ہے۔ ہماری جان، مال، عزت، آبرو (حتیٰ کہ دین اور ایمان) کی حفاظت، اس مملکت کی حفاظت کے ساتھ منسلک ہے ــــ یعنی اگر یہ مملکت محفوظ ہے تو ہماری یہ متاعِ دین و دانش بھی محفوظ ہے اور اگر یہ محفوظ نہیں، تو ان میں سے کچھ بھی محفوظ نہیں۔ اس لئے ہم جب اس مملکت اور اس کے مالۂ وما علیہ کے متعلق بات کریں گے تو اس کی حیثیت محض نظری بحث (ACADAMIC - DISCUSSION) کی نہیں ہوگی۔ اس بحث کا تعلق ہماری رگِ حیات سے ہوگا، خونِ زندگی سے ہوگا ــــ یہ سوال ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہوگا۔ اس کے ساتھ ہماری فنا اور بقا کا رشتہ بندھا

ہوگا۔ لہٰذا، اس باب میں ہم جو کچھ کہیں گے، لگی لپٹی رکھے بغیر، کھلے کھلے کہیں گے ۔۔ بے باکانہ کہیں گے تاکہ اگر کل کو (خدانخواستہ) یہ مملکت کسی خطرہ سے دوچار ہو تو ہمارا ضمیر مطمئن ہو کہ ہم نے اس کی خیر سگالی کے لئے، اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ صحیح سمجھا تھا اسے بروقت کہہ دیا تھا۔

آپ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ جس ملک میں بھی مذہب کو سیاسی اقتدار اور ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا، اسے کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔

(۲) ہمارے ملک کی کم از کم اسّی فیصد آبادی جاہل ہے اور مذہب پرست۔ اس لئے اسے مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے اپنے پیچھے لگایا اور اکسایا جا سکتا ہے۔

(۳) انفرادی طور پر، اس صورتِ حال سے، مختلف مذہبی فرقے اور پیشوا فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن جو گروہ اس سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے وہ جماعتِ اسلامی ہے۔ اس جماعت نے مذہب کو حصولِ اقتدار کے لئے سپر بنا رکھا ہے۔ اور ہمارا یہ دعوےٰ، تعصب یا مخالفت پر مبنی نہیں، حقائق پر مبنی ہے۔ آپ اس جماعت کی تاریخ کو سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ جب اس نے حکومت کی مخالفت کرنی ہوتی ہے تو حکومت کی ایک ایک بات کس طرح خلافِ شریعت بن جاتی ہے اور جب اس سے اپنا فائدہ مقصود ہوتا ہے تو وہی بات کس طرح عین مطابقِ شریعت قرار پا جاتی ہے۔ ان کی شریعت ان کے مفادات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک وجوبِ شرعیہ میں داخل ہے اور اصول توڑنا (معاذ اللہ معاذ اللہ) اتباعِ سنتِ رسولؐ اللہ! (ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور آئندہ بھی عند الضرورت لکھتے رہیں گے۔)

اس سلسلہ میں دیکھئے، کہ جماعت اسلامی کی اسکیم کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے مملکت پاکستان سردست، معیاری انداز کی اسلامی مملکت نہیں لیکن اس کے دستور میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں اس نے ملک کے مروّجہ قوانین کی چھان بین کا کام بھی شروع کر رکھا ہے۔ اور نئے قوانین مرتب کرتے وقت بھی اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ (قوانین) خلافِ کتاب و سنت نہ ہوں۔ لیکن جماعتِ اسلامی کی پالیسی یہ ہے کہ جونہی حکومت کی طرف سے کوئی قانون نافذ ہو یا کوئی فیصلہ صادر، یہ شور مچا دے گی کہ یہ خلافِ شریعت ہے ۔۔ عائلی قوانین، خلافِ شریعت ۔ خاندانی منصوبہ بندی، خلافِ شریعت ۔ حکومت کی طرف سے چاند دیکھے جانے کا اعلان خلافِ شریعت ۔ اس سے یہی نہیں کہ وہ ہنگامی طور پر ملک میں خلفشار مچاتی رہتی ہے۔ بلکہ (اس کی اسکیم یہ ہے کہ) اس طرح لوگوں کے دلوں میں حکومت کے خلاف مسلسل نفرت

پیدا کراتی اور اپنے آپ کو شریعت کی علمبردار بنا کر پیش کرتی رہے۔ یہ اسکیم بڑی گہری ہے اور اسے دقتِ نظر سے سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے لے کر اس وقت تک، ملک میں جو حکومت بھی قائم ہوتی ہے۔ اس جماعت نے شور مچا دیا ہے کہ اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو فاسق و فاجر ہیں، مغرب زدہ ہیں، خدا و رسولؐ سے بیگانہ ہیں، شریعت سے نا آشنا ہیں۔ کلبوں میں جاتے ہیں، رقص خانوں میں رنگ رلیاں مچاتے ہیں --- یہ جماعت، ہر برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف اسی قسم کا پراپیگنڈہ مسلسل کرتی چلی آرہی ہے۔ اور اس کا بھی اعلان کئے جا رہی ہے کہ ملک کے قوانین خواہ مطابقِ شریعت ہی کیوں نہ ہوں، اصل بات یہ ہے کہ ان قوانین کے چلانے والے لوگ کس قسم کے ہیں۔ اگر وہ غیر صالح ہیں تو مملکت اسلامی نہیں ہو سکتی۔ قیادت کا صالح ہونا نہایت ضروری ہے۔

ایک طرف وہ ملک کی ہر برسرِ اقتدار پارٹی کو غیر صالح قرار دیتی ہے (جس طرح تحریکِ پاکستان کے زمانے میں قائدِ اعظمؒ کی قیادت کو غیر صالح قرار دیا کرتی تھی) اور دوسری طرف اس کا اعلان کرتی ہے کہ ملک میں صالح لوگ صرف جماعتِ اسلامی میں ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب نے جولائی ۱۹۵۵ء میں سرگودہا میں ایک تقریر میں کہا تھا کہ

> اس وقت جماعتِ اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام اس نے یہ کیا ہے کہ اس نے اس ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ جس کی اس ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ، غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت کا کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و اقرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و اقرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں قوم کی اکثریت مبتلا ہے۔ جماعتِ اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابلِ اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابلِ اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔
>
> (بحوالہ الاعتصام - ۱۵ر جنوری ۱۹۵۵ء)

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ اسلامی کے مؤقف کی رُو سے، مملکتِ پاکستان کی زمامِ اقتدار اگر ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اس جماعت سے باہر ہیں، تو نہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے، نہ اس مملکت کے قوانین مطابقِ شریعت۔ اسے اسلامی مملکت بننے کے لئے ضروری ہے کہ اقتدار و قیادت جماعتِ اسلامی کے ہاتھ میں ہو کیونکہ صالح کردار کے لوگ اسی جماعت میں ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی مملکت میں زمامِ اقتدار، غیر صالح عناصر کے ہاتھ میں ہو، اور وہاں کچھ لوگ صالح موجود ہوں، تو ان صالحین کو کیا کرنا چاہیئے؟ یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھنے کے قابل ہے۔

مودودی صاحب نے گزشتہ ایک دو سال سے، اپنے رسالہ (ترجمان القرآن) میں، ایک سلسلہ مضامین، بہ عنوان ـــ خلافت سے ملوکیت تک ـــ شروع کر رکھا تھا۔ اب ان مضامین کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کا نام ہے ـــ خلافت و ملوکیت ـــ اس کتاب میں صحابہ کبارؓ کے خلاف جو کیچڑ اچھالا گیا ہے، ہمارے نزدیک کسی متعصب سے متعصب پادری کو بھی اس کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے دستِ پروردگانِ نبوت کی سیرت و کردار کا (معاذ اللہ) ایسا بھیانک نقشہ سامنے آتا ہے کہ ہر سوچنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" تو جس درخت کے پھل اس قسم کے تھے، اس درخت کے متعلق کیا کہا جائیگا؟ بہرحال یہ تو ضمنی بات تھی جس شخص کے نشترِ قلم سے حضورِ رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تک محفوظ نہ رہی ہو، وہ اگر ان کے تربیت یافتگان کے متعلق اس قسم کی ہفوات تک اتر آتے تو اس میں ایسا کونسی تعجب کی بات ہے۔ لیکن ہم نے جس سلسلہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے وہ اور ہے۔ اس میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ

> اگر اقتدار غیر صالح عناصر کے ہاتھ آجائے تو صالح جماعت پر یہ فریضہ عاید ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکومت کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔

اس سلسلہ میں وہ فقہ حنفی کے نظایر و شواہد بطور دلیل پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ غیر صالح برسرِ اقتدار حکومت کے فیصلوں کی خلاف ورزی بہت بڑا کارِ ثواب ہے اور موقعہ ملنے پر ایسی حکومت کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہونا، جہادِ عظیم ـــ وہ اس ضمن میں فقہ حنفی کے امام، ابوبکر جصاصؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:-

> پس جائز نہیں کہ کوئی ظالم شخص نبی ہو یا خلیفہ، یا قاضی یا کوئی ایسا منصب دار جس کی

بنا پر امور دین میں اُس کی بات قبول کرنا لوگوں پر لازم ہو، مثلاً مفتی یا شاہد یا نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کرنے والا۔ آیت ۔ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دین کے معاملات میں جن لوگوں کو بھی پیشوائی کا مقام حاصل ہو ان کا عادل اور صالح ہونا شرط ہے ..... اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے، وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا، اور اگر کوئی شخص اپنے آپ کو خود اس منصب پر قائم کر لے، درآنحالیکہ وہ فاسق ہو، تو لوگوں پر اُس کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم نہیں۔ یہی بات نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے اور یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کوئی فاسق حاکم (جج اور مجسٹریٹ) نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ حاکم ہو جائے تو اس کے احکام نافذ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اس کی نہ شہادت مقبول ہے، نہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کی روایت قبول کی جا سکتی ہے، اور نہ اس کا فتویٰ مانا جا سکتا ہے اگر وہ مفتی ہو۔ (خلافت و ملوکیت۔ صفحہ ۲۵۳-۲۵۲)

اس کے بعد، وہ بغاوت کے سلسلہ میں، انہی (جصاص) کا یہ فیصلہ درج کرتے ہیں۔

ظالموں اور ائمہ جور کے خلاف قتال (جنگ) کے معاملہ میں ان کا (یعنی امام ابوحنیفہؒ کا) مذہب مشہور ہے۔ اسی بنا پر اوزاعی نے کہا تھا کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کی ہر بات برداشت کی، یہاں تک کہ وہ تلوار کے ساتھ آگئے (یعنی ظالموں کے خلاف قتال کے قائل ہو گئے) اور یہ ہمارے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ابوحنیفہؒ کہتے تھے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ابتداءً زبان سے فرض ہے۔ لیکن اگر سیدھی راہ اختیار نہ کی جائے تو پھر تلوار سے واجب ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۶)

اس سے ذرا آگے چل کر مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ عباسی خلیفہ کے خلاف بغاوت کے سلسلہ میں، خراسان کے فقیہہ ابراہیم الصائغ، امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے اور اس مسئلہ پر ان سے گفتگو کی۔ اس ضمن میں امامؒ نے کہا۔ کہ

اگر ایک اکیلا آدمی اس کے لئے اٹھ کھڑا ہو تو مارا جائے گا۔ اور لوگوں کا کوئی کام بھی نہیں بنے گا۔ البتہ اگر اُسے صالح مددگار مل جائیں۔ اور ایک آدمی سرداری کے لئے ایسا بہم پہنچ جائے جو اللہ کے دین کے معاملہ میں بھروسے کے لائق ہو تو پھر

کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ (صفحہ ۲۶۵-۶۶)

اس اصولی فیصلہ کے بعد وہ ان بغاوتوں کا ذکر کرتے ہیں جو سادات (اولاد حضرت علی رض) نے خلفائے عباسیہ کے خلاف کی تھیں اور بتایا ہے کہ ان میں امام ابوحنیفہ رح کی تائید انہیں (بغاوت کرنے والوں کو) حاصل تھی۔ سب سے پہلے وہ امام حسین رض کے پوتے، زید ابن علی کی ہشام بن عبدالملک کیخلاف بغاوت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

اس خروج (یعنی بغاوت) میں، امام ابوحنیفہ رح کی پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ انہوں نے ان کے خروج کو جنگ بدر میں رسول اللہ کے خروج سے تشبیہ دی۔ (صفحہ ۲۶۷)

ازاں بعد، وہ دوسرے خروج کا ذکر کرتے ہیں جسے محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) نے عباسی خلیفہ المنصور کیخلاف کیا تھا۔ اس خروج کے سلسلہ میں وہ پہلے لکھتے ہیں۔ کہ

ان دونوں بھائیوں (نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم) کی خفیہ تحریک بنی امیہ کے زمانے سے چل رہی تھی ..... عباسی سلطنت قائم ہوجانے کے بعد یہ لوگ روپوش ہوگئے اور اندر ہی اندر اپنی دعوت پھیلاتے رہے۔ (صفحہ ۲۶۹)

اس سلسلہ میں وہ امام ابوحنیفہ رح کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ

وہ لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے اور ان سے بیعت کرنے کی تلقین کرتے تھے اور اُن کے ساتھ خروج کو نفلی حج سے (۵۰) یا (۶۰) گنا زیادہ ثواب کا کام قرار دیتے تھے۔ ایک شخص ابواسحاق الفزاری سے انھوں نے یہاں تک کہا کہ تیرا بڑا بھائی جو ابراہیم کا ساتھ دے رہا ہے اس کا یہ فعل، تیرے اس فعل سے کہ تو کفار کے خلاف جہاد کرتا ہے، زیادہ افضل ہے۔ (صفحہ ۲۹۰)

امام صاحبؒ کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :

ان اقوال کے صاف معنی یہ ہیں کہ امام کے نزدیک مسلم معاشرے کے اندرونی نظام کو بگڑی ہوئی قیادت کے تسلط سے نکالنے کی کوشش، باہر کے کفار سے لڑنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتی تھی۔ (صفحہ ۲۹۰)

اسی اصول کے تابع، مودودی صاحب لکھتے کہ امام صاحبؒ نے

المنصور کے نہایت معتمد جنرل اور اس کے سپہ سالار اعظم حسن بن قحطبہ کو نفس زکیہ

اور ابراہیم کے خلاف جنگ پر جانے سے روک دیا۔ (صلا)

ان شواہد کے بعد، مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ:

یہ طرزِ عمل بھی ٹھیک ٹھیک امام کے اس نظریہ کے مطابق تھا کہ ایک کامیاب اور صالح انقلاب کے امکانات ہوں تو ظالم حکومت کے خلاف خروج جائز ہی نہیں، واجب ہے۔ (صلا)

کہا جاسکتا ہے کہ مودودی صاحب نے صرف تاریخ کے چند واقعات اور امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کیا ہے۔ ہر مورخ ایسا کرتا ہے۔ لیکن بات یوں نہیں۔ اول تو یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب صرف تاریخی واقعات بیان نہیں کرتے بلکہ وہ ان واقعات سے ایک شرعی کلیہ وضع کرتے ہیں کہ:

ایک کامیاب اور صالح انقلاب کے امکانات ہوں تو ظالم حکومت کے خلاف خروج (بغاوت) جائز ہی نہیں، واجب ہے۔

اس "شرعی کلیہ" کو جب ان کڑیوں کے ساتھ ملایا جائے جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔

انہوں نے کہا یہ ہے کہ:

(۱) پاکستان میں اقتدار، غیر صالح عناصر کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اور اب بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔
(۲) ملک کے صالح افراد جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں۔
(۳) صالح افراد پر شرعاً واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی غیر صالح حکومت کے خلاف بغاوت کی تحریک پھیلائیں ——— اور
(۴) جب ایک کامیاب انقلاب کے امکانات نظر آئیں تو بغاوت کھڑی کر دی جائے۔ اس وقت
(۵) حکومت کے فوجی افسروں سے کہا جائے کہ ایسی صالح بغاوت کو کچلنے کے لئے حکومت کا ساتھ قطعاً نہ دیں۔ بلکہ یہاں تک کہ
(۶) اگر ایک طرف، ملک کے اندر اس قسم کی بغاوت برپا ہو، اور دوسری طرف، باہر کے کفار کے خلاف جنگ کرنی ہو، تو کفار کے خلاف جنگ کرنے کی بہ نسبت، اس بغاوت کا ساتھ دینا بدرجہا زیادہ افضل ہے۔

اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کے امیر کی کیا حیثیت ہوگی؟ اس کے متعلق بھی انہی کی زبان سے سُن لیجئے۔ وہ اپنی جماعت سے کہتے ہیں کہ

اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں، جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف، دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے۔ اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے، دراصل اس کی نہیں، بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔

(ہدایات صفحہ ۳۷)

ان حقائق کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اگر حکومت کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی کرتی، یا دوسروں کو ایسا کرنے کی تلقین کرتی ہے، تو انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ یہ مذہبی معاملات ہیں اور مذہبی معاملات میں اسلام، ہر ایک کو آزادی دیتا ہے، تو اس پراپیگنڈہ کے پیچھے کتنی بڑی سازش کارفرما ہے ۔۔۔ جن لوگوں کے دل میں پاکستان کی حفاظت، سالمیت اور بہبود کا کچھ بھی احساس ہے، ان کے لئے یہ مقام بڑے ہی عمیق فکر و تدبر کا متقاضی ہے۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا لگتم کر سوچیں کہ یہاں "مذہبی آزادی" کی آڑ میں منصوبے کیا تیار کئے جا رہے ہیں!

ایک طرف یہاں یہ کچھ ہو رہا ہے، اور دوسری طرف، ہماری بدقسمتی سے، حکومت کی طرف سے ایسے غلط اقدامات ہوتے ہیں جن سے معاملہ اور بھی نازک ہو جاتا ہے۔ اس میں پہلی اور بنیادی غلطی ہمارے موجودہ دستور پاکستان کا ناقص ہونا ہے۔ جب اس دستور کی تدوین کا سوال زیرِ غور تھا ۔۔۔ تو کانسٹی ٹیوشن کمیشن کی طرف سے ایک سوالنامہ شائع ہوا تھا جس کے جوابات اہل ملک سے مانگے گئے تھے۔ ہم نے اس سوالنامہ کے جواب میں یہ تجاویز پیش کی تھیں کہ:

(۱) آئین میں یہ شق درج کی جائے کہ ملک کا کوئی قانون، قرآن کریم کے خلاف نہیں ہوگا۔

(۲) اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ ملک کا کوئی قانون قرآن کریم کے خلاف ہے تو وہ اس کے تصفیہ کے لئے ہائی کورٹ کی طرف رجوع کرے۔ اس نزاع میں سپریم کورٹ کا فیصلہ آخری متصور ہوگا۔

جو دستور شائع ہوا اس میں شقِ اول کے متعلق درج یہ تھا کہ ملک کا کوئی قانون "اسلام" کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس کے بعد، مذہبی پیشوائیت (بالخصوص جماعتِ اسلامی) کے پراپیگنڈے کے

تابع "اسلام" کی جگہ "کتاب وسنت" کے الفاظ دستور میں درج کئے گئے۔ "قرآن" کی بجائے "کتاب وسنت" کے الفاظ سے کس قدر بنیادی تبدیلی واقع ہوگئی اور کس طرح نزاع و اختلافات کے دروازے کھل گئے۔ اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھا جا رہا ہے۔ اسے دہرانے کی نہ اس وقت گنجائش ہے نہ سردست فرصت۔ اس سلسلہ میں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ اب پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا جو یہاں کے بسنے والے تمام مسلمانوں کے نزدیک "اسلامی" ہو۔ یہ صورت حالات جماعت اسلامی نے سمجھ سوچ کر اور جان بوجھ کر پیدا کی ہے۔ کیونکہ وہ شریعت میں آخری اتھارٹی اپنے امیر کو سمجھتی ہے انہوں نے صورت حالات خود ایسی پیدا کر دی گئی ہے جس سے کوئی متفق علیہ اسلامی قانون بن ہی نہ سکے، اور اس کے بعد، حکومت کو مطعون کیا جا رہا ہے کہ وہ اسلامی قوانین مرتب نہیں کرتی ــــ اور وہ جب کبھی کوئی قانون مرتب کرتی ہے تو پراپیگنڈہ شروع کر دیا جاتا ہے کہ یہ خلافِ شریعت ہے۔

ملک کو اس بھنور سے نکالنے اور خلقِ خدا کو بہیم سے نجات دلانے کی صورت یہ ہے کہ:

(۱) موجودہ اسلامک مشاورتی کونسل کے بجائے (سابقہ لا کمیشن کے انداز کا) ایک ادارہ قائم کیا جائے جس میں کسی فرقہ کا کوئی مذہبی عالم شامل نہ ہو۔ یہ ادارہ (اسے کمیشن کہہ لیجئے) حکومت کے لئے قانون سازی کا فریضہ سرانجام دے۔ یعنی جس معاملہ میں حکومت کوئی قانون مرتب کرنا چاہے، یہ کمیشن حکومت کو بتائے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ قانون کس قسم کا ہونا چاہیئے۔

(۲) دستور میں اس قسم کی شق رکھی جائے کہ اگر کسی کو حکومت کے کسی قانون یا فیصلہ کے خلاف اسلامی نقطۂ نگاہ سے کوئی اعتراض ہو تو وہ ملک میں پراپیگنڈہ کرنے کے بجائے، ہائی کورٹ (یا سپریم کورٹ) کی طرف رجوع کرے۔ اور جنہیں چاہے، بطور وکیل عدالت کے سامنے پیش کرے۔ قرآن کریم عدالت کے لئے راہ نما ہوگا اور سپریم کورٹ کا فیصلہ اس باب میں قولِ فیصل قرار پائے گا۔

(۳) جب تک عدالت، اس قانون یا فیصلہ کو مسترد نہ کر دے، اس کی خلاف ورزی، جرم قرار پائے گی۔ اس حکم پر شدت سے عمل کیا جائے۔

یاد رکھئے۔ یوں تو دنیا میں ہر نہج کی حکومت، حسن تدبر اور جرأت مندانہ اقدامات کی متقاضی ہوتی ہے لیکن موجودہ مسلمانوں کے کسی ملک میں اسلامی مملکت قائم کرنا، جوئے شیر کا لانا ہے۔ اس کیلئے انتہائی تدبر، بلند ترین سیرت اور رندانہ جرأت درکار ہوگی۔ مذہبی پیشوائیت نے صدیوں سے مسلمانوں کے دل و دماغ پر، خدا اور رسولؐ کے نام سے، اپنا اقتدار قائم کر رکھا ہے۔ اسلامی مملکت قائم نہیں

ہوسکتی جب تک ان کا یہ اقتدار ختم نہ کیا جائے۔ اس کشمکش میں مذہبی پیشوائیت ہر ممکن حربہ اختیار کرے گی۔ آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ جب مدینہ میں، سب سے پہلی اسلامی مملکت کے قیام کی کوشش شروع ہوئی ہے تو اس کے راستے میں سب سے زیادہ رکاوٹ مذہبی پیشوائیت (اہلِ کتاب) نے ڈالی تھی۔ لیکن وہ مذہبی پیشوائیت پھر بھی غیر مسلموں کی تھی۔ آپ سوچئے کہ جب یہ مذہبی پیشوائیت، خود اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئے گی تو اسلامی مملکت قائم کرنے والوں کے راستے میں کیا کیا مشکلات پیدا نہیں کرے گی۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب مسلمانوں کی اسلامی مملکت کا شیرازہ بکھاڑا گیا ہے تو اس میں تخریبی عناصر کس طرح "خدا و رسولؐ" کے نقاب میں آگے بڑھے تھے۔ اس کی تفصیل ہم سے نہیں، خود مودودی صاحب کی زبان سے سنیئے۔ وہ "تجدید و احیاءِ دین" میں لکھتے ہیں:۔

> سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ "جاہلیت" بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی، بلکہ مسلمان بن کر آئی تھی ۔۔۔ کھلے دہریے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے "جاہلیت" اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہوں گے اور کوئی مسلمان اعلانیہ اس کی حمایت نہیں کر سکیگا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جائیے تو منافقین ہی نہیں بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔

مودودی صاحب نے تاریخ سے یہ بڑا گہرا سبق سیکھا۔ وہ پہلے اچھے خاصے ڈاڑھی منڈے فیشن پرست "مسٹر" تھے۔ لیکن جب انہوں نے حصولِ اقتدار کی اسکیم وضع کی تو سب سے پہلے اپنی وضع بدلی۔ ڈاڑھی بڑھائی، پٹھے رکھے، "مسٹر" سے "مولانا" بنے اور یوں "جاہلیت عریاں" سے جاہلیت مستور کے پیکر میں آگے بڑھے۔ اب صورت یہی ہے کہ جب ان کے خلاف کوئی لب کشائی کرتا ہے تو "بہت سے اصلی مسلمان ان کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالتے ہیں"۔

یہ ہے وہ "مقدس مخالفت" جس سے ہر اس شخص کو واسطہ پڑے گا جو پاکستان کو اسلامی مملکت

بنانے کا آرزومند ہوگا۔ اس کے لئے، اسے (اقبالؔ کے الفاظ میں) "فرزانہ بگفتار و دیوانہ بکردار" ہونے کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں جہاں تک قانون سازی اور قانون پر عمل کرنے کا تعلق ہے، اُن تجاویز کا اختیار کرنا ازبس ضروری ہوگا جنہیں اوپر پیش کیا گیا ہے۔ ان اقدامات سے، پاکستان کو آہستہ آہستہ صحیح اسلامی مملکت کی منزل کی طرف لے جایا جا سکے گا۔

لیکن قانون سازی سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ صحیح تعلیم و تربیت کا ہے جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ آپ لاکھ اسلامی قوانین بنا لیجئے، جب تک ہماری آنے والی نسلوں کی تعلیم قرآنی خطوط پر نہیں ہوگی، مملکت کبھی اسلامی نہیں بن سکے گی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے، قوانین سے کہیں زیادہ زور، اقدار (VALUES) پر دیا ہے۔ "قانون (LAW) معاشرہ کا منفی پہلو ہے۔ اس کا مثبت گوشہ اقدار سے پروان چڑھتا ہے۔ (فِيهَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ)۔

کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ ۱۷ فروری کی شام، مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جشن صد سالہ کی تقریب پر، صدر محترم نے ایک گراں قدر خطاب ارزاں فرمایا۔ اس وقت، نہ تو اتنا وقت ہے، نہ پرچہ میں گنجائش، کہ اس خطاب کے مشمولات پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جا سکے۔ اس کے البتہ دو نکات اور ایک نشیدِ امید افزا ایسی ہے جس کے تذکرہ کو اتنی دیر تک ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے فرمایا (اور کسقدر بجا فرمایا) کہ قانون کی اطاعت اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کا احترام لوگوں کے دل سے ابھرے۔ اور قانون کا احترام اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب لوگوں کو اس کے مبنی برحق و صداقت ہونے کا یقین ہو۔ یہ دونوں باتیں بڑی اہم اور اصولی ہیں۔ اس کے ساتھ بس اتنے اضافہ کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک مبنی برحق و صداقت وہی قانون ہو سکتا ہے جو خدا کی کتاب کے مطابق ہو۔ بس یہی اصل الاصول ہے۔

اور وہ نشیدِ امید افزا یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مملکت کے قوانین کی تنظیم و اصلاح کیلئے عنقریب ایک ادارہ متعین کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی انہی تجاویز کو دہرانے کی جرأت کریں گے جنہیں پچھلے صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کا پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول متعین کرے۔ اگر اب کر دیا جائے تو اس کے بعد باقی کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم بالوضاحت آئندہ پرچہ میں لکھیں گے۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

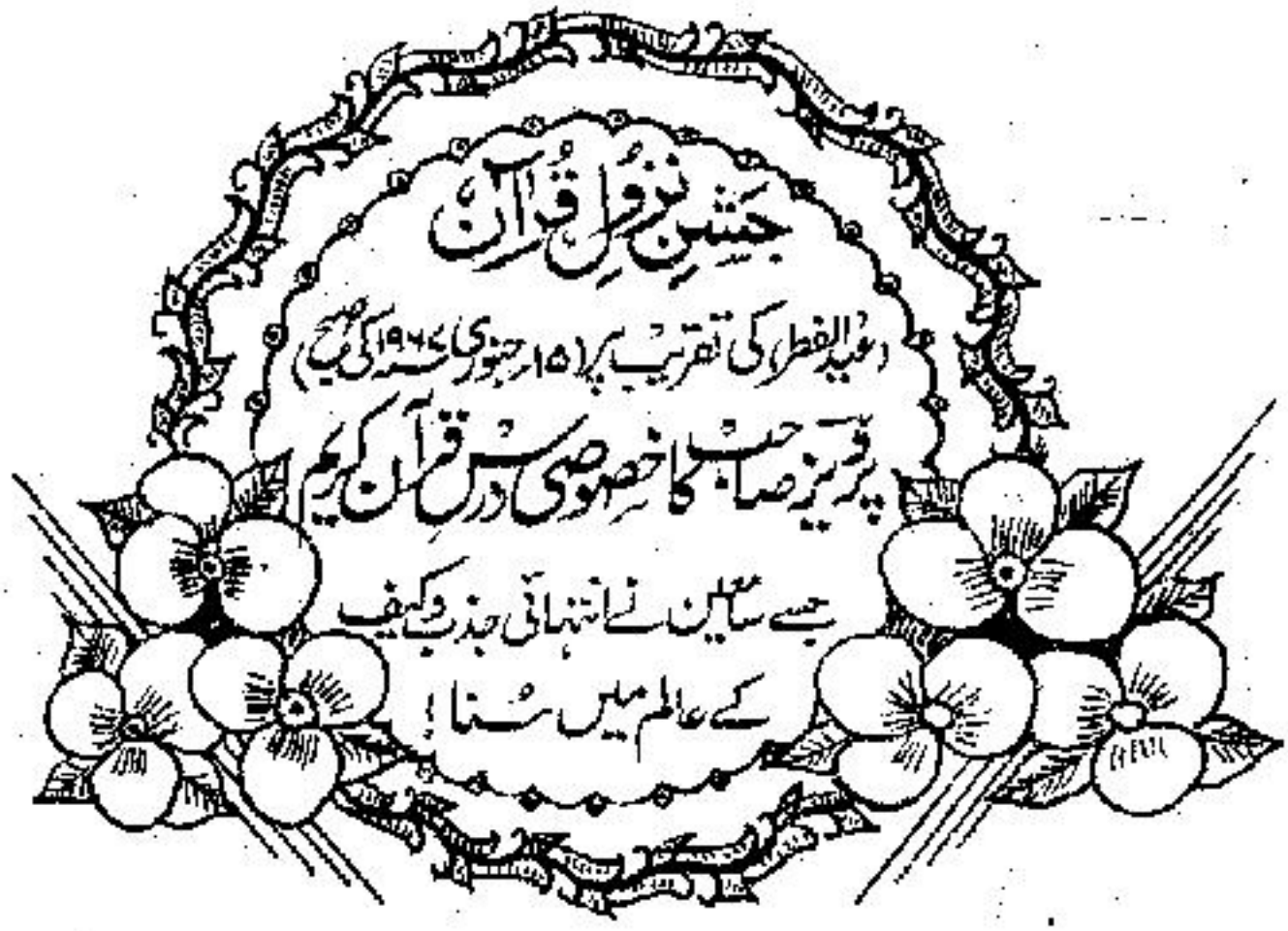

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

پرویز

اسلام، ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ، دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے۔ دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں، اور اس کا اصل الاصول، امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رُو سے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم، غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطورِ خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج 'بھارت کا مسلمان' بایں ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے، اپنی حکومت کا قیام لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ ـــــ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں، (یعنی جماعتِ مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے "تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار

کرسکو اور شرک سے بچ سکو ــــ یَعْبُدُوْنَنِیْ ۔ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (۲۴/۵۵) ــــ جب رسول اللہ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہوگیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت، یعنی باغ و بہارِ آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی ــــ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ــ نعم النصر و التمکین فی البلاد ــ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا۔ اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبۂ الٰہ آباد۔ ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

> اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں، عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خودساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ اِن قوانین کا از خود، بطیبِ خاطر اتباع کرتے جائیں[1]۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

> اسلام، تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا کہ:

---

[1] اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

اسلامی حکومت میں اطاعت اور فرمانبرداری کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(صدر آباد دکن۔ ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجہ نزاع اور سب سے شدید سببِ تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ ۔ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔ (۴۳/۲۲) ۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اُن سے، اس کے جواب میں کہا جاتا کہ ۔ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۔ (۴۳/۲۴) جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر اُس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ و اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں ۔ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ (۵/۱۰۴) ۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے ۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آبا کی، اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسول اللہؐ نے بتاکید کہہ دیا کہ

وَلَا تَرْكَنُوٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا، تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر — لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ — ہے۔ اس میں لَآ اِلٰہَ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے، ہر شے کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد اِلَّا اللّٰہُ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ:

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے۔ اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل، عدمِ حرکت، جامد و غیر متحرک ہو جانا۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حرکتِ پیہم کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے، اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پسِ پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ "وہائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ:

بت پرستی کی کنہ درحقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔[1]

---

[1] A. N. WHITEHEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P.12

اس قسم کی بت پرستی میں ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصورات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں، ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے..... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔[ل]

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھیے۔ جوہرِ زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے، محض تقلیداً کئے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشوونما ارتقا کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبالؔ کہتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگران رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید !
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآن کریم نے جس کا جشنِ نزول منانے کے لئے ہم آج جمع ہوتے ہیں، اپنا تعارف کراتے یا یوں کہیے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۹۷:۱)۔

ل A.N. WHITE HEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P.356

یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے بحیثیتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے اُلٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اوّلین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آتے تھے ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبال نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

> اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبہ الٰہ آباد)

روشِ کہن

ہمارا مروجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا، لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان "بتانِ عجم" کو حریمِ کعبہ سے نکال کر اسے خالصۃً "خدا کے گھر" میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو ازسرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت

"بتانِ عجم" کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی۔ مذہبی پیشوائیت، ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ: ؎

حکایت قدِ آں یار دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اُس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی، اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوحِ سادہ (CLEAN SLATE) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملتِ پاکستانیہ، حضور نبی اکرمؐ کے اُن الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ، بہانگِ دہل دنیا کے سامنے دُہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا۔ کل شئ من امر جاهلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان، اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا، بلکہ ساری کی ساری اُمت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ — کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۹)۔ تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے تقسیم عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں، افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین، یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں — لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ۔ (۸۲/۱۹)۔ کوئی شخص کسی دوسرے

شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق سطے پاتے چلے جاتیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ ـ (۳:۷۹) ـ تم میرے محکوم ہو جاؤ ـ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے تو صحابہؓ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ ـ مالنا ملک ـ بل لنا امیر ـ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح ہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

> یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔ کہ:

> یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ رکھ دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے لیکن تم ہمیں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت و ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کرکے بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں' بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ :-

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق۔ اور جو کچھ لوں، اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ :

تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے۔ اور اس کا حساب رکھے۔ لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں

اہل وعیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۱۸/۴۶) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْیُنٍ۔ ۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔ (۸/۲۸) یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ۔ فَاحْذَرُوْهُمْ (۶۴/۱۴) یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں؛ تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے۔ فَاحْذَرُوْهُمْ — ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے جب اس نے تنبیہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسےٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور

عبیداللہ کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کریں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیرالمومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ اُن کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں ـــــ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ ؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف ـــ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں اُن سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو، اور چاہے نیچے ہٹو۔ (تاریخ عمر۔ ابن جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔

عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ ۔ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ ۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى ۔ (۳۸/۲۶)۔ تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفعتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں۔ اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بناتے۔ قرآن کریم کا تعارف سب سے پہلی آیت میں الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطہ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد، یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کریگی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ

کرنے میں نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیلِ کار،

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ
لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۔ (۲/۴۸)

اُس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اُس سے کچھ لے لوا کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دوسرے پہچانا جا سکتا ہے ۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ۔ (۵۵/۴۱) ۔ "اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں ۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے ۔ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۔ (۶/۱۶۵)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۔ (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتمآب کی زبانِ اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۔ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر میری چہیتی بیٹی ۔ فاطمہ رض ۔ بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر، اسے از سرِ نو پبلک میں سزا دی۔ جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے گورنر اس کے بیٹے، اور اس

مصری کو مدینہ بُلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اُسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اُسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔ خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیش کش کی، آپ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکابِ جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو، خود خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹)

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ حسبِ دستور افرادِ معاشرہ کے حالات کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سُنا کہ ایک خیمہ کے اندر ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ اُمّی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو، خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آکر بیوی سے کہا کہ صبح اُس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آجائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟

لیکن افرادِ معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسرِ اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی

پیدا کرے ۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے اربابِ حل وعقد خود قانون کی اطاعت کریں ۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے ۔ جب حضرت صالحؑ کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی ؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں ۔ كَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۔ (۲۷/۴۸) ۔ مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے ۔ اگر وہ راہِ راست پر آجائیں تو ساری قوم سنور جائے گی ۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ :

> عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں ۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے ۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے ۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا ۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے ۔ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے ۔ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ۔ (۱۸/۲۸) ۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں ، تو اس کی اطاعت مت کرو ۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ :

> اگر ایک ناک کٹا ، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو ، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے ، تم اس کے حکم کو سنو اور اسکی اطاعت کرو ۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں ، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ :

> تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں ۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں ۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ :

> یاد رکھو ! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا

کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کیجائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے، تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اوّل — حضور نبی اکرمؐ نے خود فرما دیا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْن۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرتسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا۔ اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل — یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ — اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؛ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (JUST) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب — DUE) کا تعین پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRIN-CIPLES)

کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔
> (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ از روئے قوانینِ خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ :

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

سطحِ ارض پر کوئی ذیحیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ :

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

(تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہِ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی ــــ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے ــــ یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری ــــ اسی کو اپنے نے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشو و نما فراہم کرنا۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ زمین ہے اور قرآن کی رو سے زمین پر ــــ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوتی ہے ــــ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) قرار دیا ہے یعنی اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ لَنَا رِقَابُ الْاَرْضِ ــــ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربوٰ کا مفہوم

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد سب سے اہم سوال حصولِ دولت کا ہے۔ عصرِ حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیئے

یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔ اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ اربابِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے — اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ — وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا — ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد کہا کہ — فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۔ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا و رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ مملکت کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے — ربٰو کے معنی ہیں "سرمایہ پر بڑھوتی" — (سود تو اس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ربٰو کا مرتکب، اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لئے اسے "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا، قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى — (۵۳/۳۹) — یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے — يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹) — تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان

سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہؐ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ سے کہا ہے کہ:

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔ اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جاتے اسے مت روکو۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہو گا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم

اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیادیہ اصول بتایا جاتا ہے:

FROM EACH ACCORDIND TO HIS CAPACITY;

TO EACH ACCORDIND TO HIS NEEDS.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں، سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندہ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصہ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق — یعنی سامانِ زیست — مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ — اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰی - وَ (اَنَّكَ) لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰی۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)۔ نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو، اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں

ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــــ وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ۔ (۷۶/۱۲)ــ نہایت اعلےٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات ــــ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُندُسٍ وَ إِسْتَبْرَقٍ۔ (۱۸/۳۱)ــــ دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے ــــ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ــــ مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ اٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ أَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ۔ (۷۶/۱۵)ــــ چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ ــــ نَعِيمًا وَّ مُلْكًا كَبِيرًا ــ (۷۶/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اوّلین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی و طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں ــ اور نکبت و افلاس سے پستی و دناءت کے انسانیت کُش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا ــــ حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں ــــ اور دوسری طرف بے عملی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ، یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جاتی ہیں تو ان، وجہ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّ لَا تَأْثِيمًا ــ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو ــــ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ۔ (۵۶/۲۵-۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز و آہنگِ جاں افروز سنائی دیتی ہے ــــ وَ نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ ۔ (۷/۴۳) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے

ن ضرورت پڑے۔ تکریم انسانیت اور احترام آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا انداز وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبال نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش

فکرِشاں بے دردِ و سوزِ اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کوش دہقاں چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجو! — حاصلش بے شرکتِ غیرے از او!!
اندراں عالم نہ لشکر نے نقوش — نے کسے روزی خورد از کشت وخوں
نے قلم در مغربی گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ
نے ببازاراں ز بے کاراں خروش!
نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

آخر میں اقبال نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ — (۲۱/۹۲)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز — مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (۳/۷۸) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ

وہ لوگوں کو اپنا محکوم بناتے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود اربابِ نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

> اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں ـــــ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضورؐ نبی اکرم کا یہ ارشادِ گرامی کہ

> جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور حُسن و خوبی چل سکتا ہے جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

> یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا۔ اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ، اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایتِ کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی، جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا ـــ عبداللہ ـــ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلك اللہ ـــ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک

گئے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ واقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ

> سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتدا، تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدمِ تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں، تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی، کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ اور نہ ہی اس ایسا جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب واحساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔ کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔ (اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔ مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور، ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے اس لئے اسے موت کا ڈر

ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے حکومت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو، اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد، اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبال کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ — (MILL - STONE) کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح اُبھر کر باہر آتی ہیں، کہ وہ کچھ اور ہی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔ اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاء کرام سے کہا کہ:

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا۔ (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمال صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانہ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا، تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جب جنت میں رہتا تھا، وہاں اُسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ — وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا — (۲/۳۵) وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آگئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ — يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ (۲۰/۱۱۷) — تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آگیا، جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوًّا۔ (۲۰/۱۲۳) — کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آگئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرمؐ کا مقصد

قرآنِ کریم نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ــ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) ــ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی، اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل وہ خوف وہراس تھا جو "روحانی قوتوں" کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آرہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی اُلجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں، ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختمِ نبوت[1] کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ ــ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ــ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی ماوق الفطرت عنصر یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے، انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو اُبھرنے اور نشو ونما پانے کا کُلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنے اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے اربابِ فکر وعمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو، اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اُس نے نفی میں جواب دیا، تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے، اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین

---

[1] ختمِ نبوت کے بعد "آسمانی آواز" قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لئے مکمل ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ: چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔ اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا۔ کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار، اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ملنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی۔ اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر — قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے اس محبوسِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کہنے یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ — لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ — ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن — یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں — کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں — قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا، جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی اور اُسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ملنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیردستوں کو بالادستوں کی طرف سے ہر وقت وجۂ سوہانِ روح بنا رہتا ہے سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکایک سواری کو روکا۔ نیچے اُترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا۔ اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا

کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا، اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے، پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں — قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ — اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ — کس قدر قابلِ حمد و ستائش خدا کا وہ نظام جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت "تاج العروس" میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح و شام سے کھانے کی فکر۔ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ — اَلَّذِیْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۔ (۳۵/۳۴-۳۵) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی، نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے — فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی، اور باہمی خوش معاملگی، یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات و حسنات۔

قرآنِ کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ — سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشو و نما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا — جیسا کہ

شروع میں بتایا جا چکا ہے، انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد و ستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد و ستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے عکس، دوسرے اربابِ اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (۳/۱۸۸)۔ ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گزار ہونا بھی چاہتا ہے، تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ۔ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے "امام مہدی" کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا، ورنہ اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا، نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔ آپ نے اس سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ۔ يَقْسِمُ الْمَالَ صِحَاحًا۔ وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا، آپ نے فرمایا کہ۔ بالسوية بين الناس۔ تسویہ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشو و نما تک پہنچ جانا۔ اَلسَّوِيُّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔ اِسْتَوَى الرَّجُلُ۔ کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم "تسویۃً" کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشو و نما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا

جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ :

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؒ) نے یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
میری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز اور ایک حدیث ہے دلخراش۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب نا تمام کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوتی ہے۔ آپ سورۃ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ :

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ....

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اُس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا۔ اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہونا کیوں سے اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اُسے اُکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذَالِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے ۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ، شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔

سَاءَ مَثَلَ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ اُف! کس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ ۔ وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۔ وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں خود اپنا ہی نقصان کر کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے ۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے ۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سُنائی نہیں دیتا ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں ۔ یہ انسان

نہیں، حیوان ہیں ___ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ___ نہیں؛ یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں ___ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ (۷/۱۷۹) ___ حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا، اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں ___

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور:- بزم لاہور حسبِ معمول اشتراک سے طلوعِ اسلام اور اس سے متعلق لٹریچر کی اشاعت کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں جدوجہد کر رہی ہے اپنی مرکزی پوزیشن کے پیشِ نظر اراکین بزم محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسِ قرآن کے انتظام اور تحریک کے پیغام کو لاہور اور اس کے مضافات میں عام کرنے کے علاوہ ادارہ کے روز افزوں کام اور نظم و نسق میں زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹانے کیلئے اپنا وقت رضاکارانہ طور پر دے رہے ہیں جسکے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ سلسلِ درسِ قرآن میں اب ہم چھبیسویں پارہ تک پہنچ چکے ہیں اور جوں جوں یہ سلسلہ قرآن کریم کے آخری طرف بڑھ رہا ہے، قرآنی حقائق کی تعلیم نہایت جامع اور مرکوز صورت میں نکھر نکھر کر اس کتاب عظیم کی معجزانہ ترتیب سے سامعین کو مسحور کر رہی ہے درس میں شامل ہونیوالوں کی تعداد میں طالب علموں، خواتین اور پڑھے لکھے طبقہ کا روز بروز اضافہ ہو رہا ہے بعض احباب باہر کے مقامات اور مضافاتِ لاہور سے آکر بھی شرکت کرتے ہیں۔

بزمِ کراچی:- بزم کراچی کی روز افزوں سرگرمیوں کی روئیداد ہفتہ وار تفصیلی رپورٹوں کی صورت میں نہایت باقاعدگی سے ادارہ میں آ رہی ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بزم کے جواں ہمت نمائندہ محمد اسلام صاحب اور انکے رفقائے کار بھرپور مجاہدانہ جوش و خروش سے ساتھ مسلکِ طلوعِ اسلام اور قرآن کے پیامِ ربوبیت کی نشر و اشاعت کے ولولے سے سرشار رہتے ہیں۔ اس بزم کی مساعیٔ جمیلہ تا حال تحریک کی ترقی و اشاعت کے جن پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوتے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں۔

● سندھ اسمبلی حال کراچی میں ہر اتوار کی صبح کو محترم پرویز صاحب کے ٹیپ شدہ درسِ قرآن کا انتظام۔ اس موقعہ پر رسالوں اور متعلقہ مفلٹس کی مفت تقسیم۔ تحریک کے خصوصی لٹریچر اور کتب کا تعارف اور سامعین کو ان کا قیمتاً اور بلاقیمت مہیا کرنا۔ ● مطبوعات طلوعِ اسلام کی اشاعت کیلئے کراچی کے ہر گوشہ میں کتب فروشوں، بک سٹالوں اور ہاکروں کے ذریعہ فروخت کتب کا رابطہ اور اس کا روز بروز جائزہ۔ ● مقامی کالجوں اور درسگاہوں میں رسالہ طلوعِ اسلام اور مفلٹس کی منظم تقسیم۔ ● کراچی کے کتاب میلہ میں کتاب اسلامی معاشرہ کی نمائش۔ ● رسالہ کے خصوصی مضامین کے متعلق ادارے کے ارسال کردہ پوسٹروں کے ذریعہ اشاعت۔ ● رسالہ طلوعِ اسلام کیلئے حصولِ اشتہارات کی منظم کوشش۔

(باقی صفحہ ۶۸ پر ملاحظہ ہو)

خورشید عالم

چین کا عالمی کردار ۳

پہلی عالمگیر جنگ کے تجربے کا جائزہ لیتے ہوئے اقبالؒ نے "پیامِ مشرق" کے دیباچے میں لکھا تھا۔

یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اسکے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔

آج سے کوئی نصف صدی پیشتر اقبالؒ ہی کی آنکھ مستقبل کے خدوخال کو یوں صاف طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اقبالؒ نے بالکل درست کہا تھا کہ "یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔" پہلی عالمگیر جنگ میں نتائج کی خوفناکی میں اگر کوئی شبہ باقی رہ گیا تھا تو دوسری جنگِ عظیم اور اس کے بعد کے کوائف و حوادث سے وہ رفع ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ یورپ اسباب و علل کے قدرتی تعلق کو بدل کر نتائج کو معطل یا واژگوں کرنا چاہتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ نے اقوام و ممالک کی جو آزادی کی طرح ڈالی، اسے دوسری جنگ نے بطورِ خاص تقویت پہنچائی۔ چنانچہ بہت سے ایشیائی اور افریقی ممالک استعمارِ فرنگ سے کلو خلاصی حاصل کر گئے۔ آزادی کی یہ رو اس لحاظ سے کہیں زیادہ خوش آئند ہو گئی کہ امریکہ جو دوسری جنگ سے برتر عالمی قوت بن کر ابھرا تھا، نو آزاد ممالک کی معاشی بحالی میں ممد و معاون ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ اتنے امیر ملک کی امداد متعلقہ ممالک کے لئے بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن حالات نے بہت جلدی یہ ثابت کر دکھایا کہ نہ استعمارِ فرنگ کی پسپائی خوش دلانہ تھی نہ امریکہ کی امداد خیر خواہانہ ہے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں نے یورپ کو اس پر تو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی غلامی کے جال کو سمیٹ لے لیکن وہ اس کی اندرونی گہرائیوں میں مطلوبہ انقلاب نہ پیدا کر سکے۔ چنانچہ یورپ نے جو مشکل دنیا کے لئے دو صدیوں سے پیدا کر رکھی تھی۔ وہ بدستور موجود ہے۔ البتہ اس کا رنگ بدل گیا اور آزاد ہونے والی ایشیائی اور افریقی اقوام کو اسے سمجھنے

ہیں وقت لگا۔

یورپ کے استعماری ذہن کا نمائندہ امریکہ بن گیا جو شروع شروع میں تو اشتراکیت کے سیلاب کے سامنے بند باندھنے میں لگا رہا۔ پھر بتدریج ایشیا کی طرف متوجہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ امن عالم کے لئے مستقل خطرہ بن گیا ہے۔ امریکہ کو یہ کردار ادا کرنے پر دراصل چین کے انقلاب نے مجبور کیا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ امریکہ استعمار فرنگ کو پھر سے دنیا پر مسلط کرنے کے درپے ہے اور چونکہ وہ چین کی بیداری کو ایشیا بلکہ غیر یورپی دنیا کی بیداری کی تمہید سمجھتا ہے، اس لئے وہ آگ بگولہ ہو کر چین کو نیچا دکھانے میں طرح طرح کے جتن کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف چین کی بیداری اور ترقی کو استحقار کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے آپ سے مقابلہ کر کے اس کا استخفاف کرتا ہے اور دوسری طرف چینی خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے دوسری قوموں کو تخویف و تحریص سے چین کے خلاف صف آرا کرنے میں صبح و شام لگا رہتا ہے۔ امریکہ کی اس متعصب مگر خالصتہً یورپی ذہنیت نے چین کو عالمی سیاست کا درجۂ اول کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ لیکن جسے چین کا مسئلہ کہا جاتا ہے وہ چین کا نہیں امریکہ کا مسئلہ ہے۔ یورپ دو سو سال سے جو زہر جسدِ تہذیب میں بھرتا چلا آیا ہے، اس کی اصلاح استعمارِ فرنگ کی سیاسی پسپائی سے نہیں ہو سکی کیونکہ امریکہ فنی ترقی کے بل بوتے پر وہی زہر بدستور بھرے چلے جانے پر مصر ہے۔ یہ اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک امریکہ زہریلی یورپی ذہنیت کو خیرباد کہہ کے انسانی اقدار کا قائل نہیں ہو جاتا۔ اس وقت چین کے نام پر دنیا بھر کو یہی معرکہ درپیش ہے۔

چین میں انقلاب کے آثار دکھائی دینے لگے تو امریکہ اس کے مقابلے کے لئے محاذ چین پر آموجود ہوا۔ اس نے چین میں عسکری اور معاشی امداد کے دریا بہا دیئے۔ لیکن جس آگ کے شعلے ضمیرِ چین سے اُبھرے تھے وہ فرو نہ ہو سکی۔ الٹا اُس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، دستِ فطرت بڑی تیزی اور صفائی سے گریبانِ یورپ کو چاک کر رہا ہے۔ یورپی عبا قامتِ انسانیت پر نہ کبھی راست آسکی تھی اور نہ اسے اتار پھینکا جا سکتا تھا۔ اب اُس کے تار تار ہو جانے کے سامان پیدا ہو رہے ہیں۔ اور فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ نتیجہ ہے ان حرکاتِ مذبوحی کا جو امریکہ سے اس عبا کی حفاظت کے لئے سرزد ہو رہی ہیں۔ بہرحال امریکہ نے سرتوڑ کوشش کی کہ چین اپنا نظامِ کہن نہ بدلے اور انقلاب کے ثمرات سے متمتع نہ ہو سکے۔ یہ کوششیں سرتاسر ناکام ہوئیں اور امریکہ کے علی الرغم انقلاب کامیاب ہو کے رہا۔ اس ناکامی سے دوچار ہو کر امریکہ چین سے تو نکل آیا۔ لیکن چلتے چلتے چینی جزیرے فارموسا پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔ اور محض دُم کو پورا ہاتھی سمجھنے لگا۔ وہ فارموسا کو چین کہہ ہی نہیں رہا بلکہ کہلوا بھی رہا ہے۔ اسی فارموسا کو اس نے اقوام متحدہ میں چین کی مستقل نشست پر زبردستی بٹھا رکھا ہے۔ چین اقوام متحدہ کے پانچ مستقل ارکان میں سے ایک ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ چین کی نشست

تو فارموسا سے پُر ہوگئی۔ اب جو ماؤزے تنگ والا چین ہے یہ چین نہیں ہے ایک نیا ملک ہے۔ اس لئے اس کی رکنیت کا مسئلہ نئی رکنیت کے طور پر طے کیا جائے۔ ساتھ ہی اُس نے بڑی چالاکی سے یہ فیصلہ کرا لیا، کہ اس رکنیت کے لئے دو تہائی اکثریت ضروری سمجھی جائے۔ حالانکہ قاعدے کی رُو سے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کثرت رائے سے نئے ممالک کی رکنیت کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ امریکہ کا یہ اقدام محض اس لئے ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح چین کو اقوامِ متحدہ سے باہر رکھے۔ کیونکہ اسے یقین ہے کہ چین کے عالمی ادارے میں آجانے سے توازن قوی اس کے حق میں نہیں رہ سکے گا۔

اقوامِ متحدہ میں چین کا داخلہ روکنے کے لئے امریکہ کو بہانہ تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ فارموسا میں بزعم خود قدم جما کر اُس نے چین کے لئے ایک اور محاذ کوریا میں کھول دیا۔ وہ کوریا کے راستے چین تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایسا کرنے کے لئے اس نے اقوامِ متحدہ کی آڑ لی۔ گو کوریا میں زیادہ تر امریکی فوجیں ہی تھیں۔ تاہم امریکہ نے کئی ایسے ممالک کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا جنہیں وہ عسکری اور معاشی وسائل بہم پہنچا رہا تھا۔ اور ان سے علامتی تعاون حاصل کر کے اقوامِ متحدہ کو کوریا میں کاغذی طور پر متحارب فریق بنا لیا۔ یعنی ہر چند کوریا میں امریکہ لڑتا رہا۔ وہ نام اقوامِ متحدہ ہی کا استعمال کرتا رہا۔ اس طرح امریکہ کوریا میں تو چین کو زک نہ پہنچا سکا۔ لیکن یہ دلیل ضرور گھڑ لی کہ چین جیسا ملک، جو اقوامِ متحدہ سے برسرِ پیکار رہ چکا ہو، بغیر توبہ کئے رکن نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ دلیل سرتاسر لغو ہے۔ اول تو چین کو کوریا میں جارح نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر بالفرض اسے جارح تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بنا پر اسے اپنی مخصوص نشست پر فائز ہونے سے روکا جا سکتا ہے۔ اگر کسی جارح ملک کو واقعی اقوامِ متحدہ سے خارج رکھا جا سکتا ہے تو کئی ایسے رکن ہیں جنہیں اس بنا پر رکنیت سے محروم کر دینا چاہیئے۔ مثلاً جنوبی افریقہ جس کے مقاطع کا فیصلہ عالمی ادارے نے کر رکھا ہے۔ یہی سلوک بھارت سے روا رکھا جانا چاہیئے جو اس ادارے کے فیصلوں کو تسلیم کر لینے کے باوجود ان پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اگر کسی رکن کو جارحیت کے مرتکب ہونے کی بنا پر رکنیت سے محروم نہیں کیا جا سکتا، تو کسی اور جارح ملک کو اس بنا پر کیسے اقوامِ متحدہ سے باہر رکھا جا سکتا ہے۔

لیکن زمانے کے رنگ اپنے ہیں۔ امریکہ جیسے چین میں ناکام ہوا، اسی طرح وہ کوریا میں بھی نامراد رہا۔ یہ دوسری شکست تھی جو امریکہ کو چین کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ امریکہ زہریلے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اور اپنی آتشِ انتقام بجھانے کی اور راہیں تلاش کرنے لگا۔ حالات نئے اور راستہ دکھانے میں چنداں تامل نہ کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے وہ علاقے جنہیں کبھی ہند چینی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا فرانس سے گلو خلاصی کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے بالآخر فرانس کو شکست دی اور اپنا حق آزادی منوا لیا۔ یہ فرانس کی

حقیقت پسندی کی دلیل تھی کہ اس نے جب دیکھا کہ وہ ان علاقوں کو غلام بنا کے نہیں رکھ سکتا۔ تو اس نے سمجھوتہ کر کے انہیں آزاد کر دیا۔ لیکن یہ علاقے "اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" کے مصداق امریکی استعمار کا نشانہ بن گئے۔ فرانس کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اُسے پُر کرنے میں امریکہ نے فدا دیرنہ کی۔ اس نے ویت نام کو خاص طور پر منتخب کیا اور اپنے عزائم مشئومہ کی آماجگاہ بنا لیا۔ اس ملک پر اُس نے فرانس کیطرح قبضہ تو نہ کیا بلکہ اشتراکیت کے خلاف امداد بہم پہنچانے کے لئے بن بلائے مہمان کی طرح آ دھمکا۔ اُس نے اپنی فوجیں وہاں اتارنا شروع کیں اور دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ امریکہ بلاواسطہ متحارب فریق بن گیا۔ اس جنگ کا دوسرا فریق ہے تو ویت نام، لیکن امریکہ بزعم خود چین ہی سے لڑ رہا ہے۔ کوریا میں بھی وہ چین ہی سے لڑا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ وہ کوریا میں جس دلدل میں پھنس گیا تھا اسی دلدل میں وہ ویت نام میں بھی پھنس چکا ہے۔ کوریا کی طرح ویت نام میں بھی لڑائی ایسے مرحلے میں پہنچ چکی ہے کہ امریکہ اپنے آپ کو چین کے روبرو پا رہا ہے۔ وہ اس صورتِ حال کے تقاضے پورے کرتے ہوئے چین کے منہ آتا ہے تو عالمگیر جنگ یقینی ہو جاتی ہے۔ امریکہ معاملے کو یہاں تک طول دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہمہ گیر جنگ کی صورت میں اس کی اپنی تباہی یقینی ہے۔ لیکن اب امریکہ کے لئے "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" والی بات ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے تو اپنی تباہی مول لیتا ہے اور پیچھے ہٹتا ہے تو تیسری بار شکست سے دوچار ہوتا ہے۔

اس کی یورپی ذہنیت عجیب گل کھلاتی رہتی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ شمالی ویت نام کو امریکہ صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے اور کبھی دھمکی ملی خوشامد سے اُسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بات دونوں طرف نہیں بنتی تو سازشوں کے نالے چڑھ کر ایک اور راہ سے بہ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکہ بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے کہ ایشیائی ممالک اس کا ساتھ دیں اور متحد ہو کر چین کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ برسوں پہلے اس نے تنظیم متشکل کی۔ لیکن اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت پہلے دن سے مضمر تھی۔ پاکستان نے معاہدے پر دستخط کرتے ہی اعلان کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک جارحیت، جارحیت ہے خواہ وہ اشتراکی ہو یا غیر اشتراکی۔ لہٰذا اس تنظیم کو غیر اشتراکی جارحیت کو اپنے دائرہ کار سے خارج نہیں کرنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ فرانس بھی اس تنظیم سے بددل ہوتا گیا۔ امریکہ پاکستان کو اس خیال سے گھسیٹ لایا تھا کہ دونوں کا عسکری معاہدہ تھا لیکن پاکستان کا حقیقت پسندانہ رویہ دیکھ کر امریکہ سیٹو کے مستقبل ہی سے مایوس ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ اور ٹامک ٹوئیے مارنے سے باز نہ آیا۔ اس نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی سفید فام حکومتوں کو ایشیائی کہہ کر ان سے استمداد کی۔ ایک حد تک یہ مدد تو مل گئی لیکن نہ ایشیا کے اندر، نہ ایشیا کے باہر، اسے کسی نے ایشیائی مدد نہیں کہا۔ اس پر بھی امریکہ باز نہ آیا۔ اس نے ایشیائی ملکوں پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ بھارت۔

جیسا کہ بھارت سے متعلق مضامین میں وضاحت کی جا چکی ہے — پوری طرح امریکہ کا طفیلی بن گیا۔ اور اس نے چین کے خلاف اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکہ کے حوالے کر دیا۔ یہ ذلت کسی اور ایشیائی ملک نے قبول نہیں کی اور نہ کوئی کر ہی سکتا ہے۔ انڈونیشیا اور جاپان کو بھی امریکہ اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اول الذکر ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ رائے عامہ پہلے کی طرح چین کے حق میں نہ رہے۔ لیکن یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ کہ انڈونیشیا چین کے خلاف امریکہ کا آلۂ کار بن جائے گا۔ انڈونیشیا چین کے ساتھ جیسے بھی مراسم رکھے، وہ استعمار فرنگ کا موید نہیں ہو سکتا۔ جاپان بھی علیٰ ہذا القیاس امریکہ کے فریب میں آتا دکھائی نہیں دیتا۔

امریکہ دوسری قوموں کو حیلوں بہانوں سے چین کے خلاف کرنے اور اپنے ساتھ ملانے سے باز تو کیا آئے گا لیکن اس کی کامیابی کے امکانات کم سے کم ہیں۔ اور اس کا تجربہ بالعموم مایوس کن ہے۔ لیکن وہ ایک اور ہی عالمگیر دیوار چین کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ جیسے روما الکبریٰ کے دورِ عظمت میں تمام راستے روم کو جایا کرتے تھے اسی طرح امریکہ کی یہ حالت ہے کہ وہ کسی جگہ سے کسی سمت کو قدم اٹھائے اس کی نظریں چین پر لگی ہوں گی اور وہی اسکی منزل ہوگی۔ اس کی عسکری تنظیم نیٹو شمالی اوقیانوس کے ممالک کی تنظیم تھی کبھی فرانس نے الجزائر کے لئے اس سے استمداد کی تو وہ اس بنا پر مسترد کر دی گئی کہ یہ تنظیم شمالی اوقیانوس کے ممالک تک محدود ہے اور انہی تک محدود رہنی چاہیئے۔ لیکن فرانس کا مطالبہ رد کرنے والا امریکہ آج خود ایسی مشکل سے دوچار ہے کہ وہ نیٹو کو چین کے خلاف استعمال کرنے کی باتیں ڈھٹائی سے کرنے لگا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ وہ اس تنظیم میں شریک ہے اس لئے اس کے مغرب کا اس تنظیم کو خیال رکھنا چاہیئے۔ اور اپنی مغرب سے مراد وہ چین لیتا ہے۔ لیجئے پورا بحر الکاہل عبور کر کے! یہ منطق امریکہ کو موجودہ مخصوص حالتِ اضطرار میں ہی سوجھ سکتی ہے۔

امریکہ شمالی اوقیانوس کو مغرب کی طرف سے بحر الکاہل سے ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو ایک اور رابطہ وہ بہت پہلے قائم کر چکا ہے۔ شمالی اوقیانوس میں نیٹو ہے تو بحرِ روم میں اس کا آٹھواں بحری بیڑہ ہے۔ اس سے اگلی کڑی چھٹا بحری بیڑہ ہے۔ اور بحرِ افریشیا (نام نہاد بحرِ ہند) میں متعین ہے۔ یاد رہے کہ جب امریکہ کی شہ پر بھارت نے چین پر حملہ کر دیا تو جہاں امریکہ نے بھارت کو اپنے عالمی عسکری اڈوں سے منسلک کر دیا وہاں بحرِ افریشیا میں اپنا بحری بیڑہ بھی گشت کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس سے بہت پہلے امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ جنوبی چینی سمندر میں متعین تھا۔ گویا یوں شمالی اوقیانوس کو بحر الکاہل سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ امریکہ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جنوب مشرقی ایشیا اور بحر الکاہل میں بڑی کثرت سے فوجی مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ یہ ساری تیاری ایک چین کے خلاف ہے۔ امریکہ نے اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد ہی چین کو بنا لیا ہے۔ چین کے دوست کو وہ اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اور اپنے دوست کو چین کا دشمن بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ وہ معاشی

"امداد" کو بھی اسی پیمانے میں تولتا ہے اور اسے چین کے خلاف فضا پیدا کرنے میں صرف کرتا ہے۔

امریکہ کی ٹکر کی دوسری بڑی عالمی طاقت روس ہے۔اس کا رویہ بھی چین سے متعلق نمایاں طور پر بدل گیا ہے کبھی وہ چین کے محاذ پر امریکہ سے لڑا تھا اور انقلاب کو کامیاب بنانے میں اس نے چین کا ہاتھ بٹایا تھا۔ لیکن وہ نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے چین کا رفیق نہیں رہا۔ روس اشتراکی عزائم لے کے اٹھا اور اس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ اشتراکی اصولوں ہی کا داعی اور علمبردار رہا۔ لیکن اب وہ معاشی خوشحالی کے ایسے دور میں داخل ہو چکا ہے کہ اس کی نظریں امریکہ کی طرف مڑنے لگی ہیں اور وہ اشتراکیت اور روسیت کو مترادف سمجھنے لگ گیا ہے۔ چین کا نظریہ ابھی تک بالائے قومی اور عالمگیر ہے۔ اس اختلاف نے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت یہ ہو گئی ہے کہ وزیر اعظم روس کو یہ اعلان کرنا پڑا ہے کہ چین اور روس میں جنگ چھڑنے کا کوئی امکان نہیں۔ گو روس ابھی تک امریکہ کی طرح چین کا حریف نہیں بنا تاہم یہ کہنا غلط نہیں کہ دونوں اس دوراہے سے آگے نکل گئے ہیں جہاں ہر ایک کی راہ الگ الگ ہو جاتی ہے۔ روس جس انداز سے امریکہ کی طرف جھکتا جا رہا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں غلط نہیں کہ اس کی بھی یورپی رگ پھڑک اٹھی ہے اور وہ چین کو ایک غیر یورپی قوم سمجھ کر اسے زیادہ سے زیادہ ناقابل برداشت سمجھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے امریکہ کو خاصی شہ ملی ہے اور وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا چلا جا رہا ہے کہ وہ روس کو چین سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اسے یہ کامیابی کہاں تک حاصل ہو سکے گی، یہ کہنا مشکل ہے۔ روس چین کا حریف بن سکتا ہے وہ اس کی دشمنی میں خاصا آگے بھی نکل سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روس اور چین میں تصادم تک نوبت پہنچ جائے (کیوں کہ دونوں میں ایسے دیرینہ سرحدی تنازعات ہیں جو کسی وقت بھی سنگین صورت حال پیدا کر سکتے ہیں) روس یہ تو سوچ سکتا ہے کہ وہ اپنے طور پر چین کو نیچا دکھا دے اور ایشیا کی قیادت خود سنبھال لے، لیکن وہ یہ کبھی گوارا نہیں کر سکے گا کہ چین کو امریکہ نیچا دکھائے۔ امریکہ اس قابل ہو جائے یا روس اسے ایسا کرنے کی اجازت دیدے تو ایشیا میں روس کا زبردست حریف امریکہ پنجے گاڑ لے گا اور روس کو للکارے گا۔ روس کے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال خوش آیند نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ روس چین سے علیحدہ ہو کر بھی چین کی مخالفت میں ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ امریکہ اسے اچھی طرح سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ گومگو میں ہے۔ اسے اتنا تو یقین ہے کہ دونوں اشتراکی دیو پہلے کی طرح کندھے سے کندھا ملا کر نہ کھڑے ہیں اور نہ کھڑے ہو سکیں گے۔ لیکن اسے خطرہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز کر گیا تو روس سے اس کا آمنا سامنا ناگزیر ہے۔ وہ روس کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتا اور دوستی ایک حد تک ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح روس اور امریکہ چین کے اتنے بڑے حریف ہونے کے باوجود اپنے ذرائع کو چین کے خلاف

مجتمع نہیں کر سکتے۔ گویا اگر امریکہ روس اور چین کو علیحدہ دیکھنے میں کامیاب ہو سکا ہے تو چین امریکہ اور روس کے اکٹھے ہونے میں حائل ہے۔ امریکہ کی کامیابی اپنی جگہ، چین کی کامیابی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ چین کو امریکہ اور روس کی دوستی کا اتنا نقصان نہیں پہنچ رہا جتنا دونوں کی مغائرت کا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ وہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے اور اپنے انقلاب کو نتیجہ خیز بنانے میں مسلسل کوشاں ہے۔ اب شاید چین کے انقلاب کا راستہ نہ روکا جا سکے۔ یہ روگ بہرحال امریکہ اور روس دونوں کے بس کا نہیں رہا لیکن عالمی سیاست میں جو کشیدگی پیدا ہو چکی ہے اس کی اصلاح کی صورت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک امریکہ کے دماغ سے یورپی برتری کا خناس نکل نہیں جاتا۔ اور وہ نسل اور رنگ کے امتیازات کو انسانی اقدار پر قربان نہیں کر دیتا۔ یہ اصلاح تنہا چین کا کام نہیں۔ اس کے لئے ایشیا اور افریقہ دونوں کو انتھک کام کرنا پڑے گا۔ چین کے انقلاب کی اٹھان نے دونوں بر اعظموں کو یہ راستہ دکھا بھی دیا ہے اور انہیں اس راستے پر ڈال بھی دیا ہے۔ اب لبِ زمانہ پہ یہ صدا بار بار آ رہی ہے کہ ـــ

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق !

ضرورت رشتہ

(۱) لڑکے کیلئے ـــ لڑکے کی عمر۔ ۲۵ سال

ملازمت۔ پرائیویٹ کنسرن

تنخواہ۔ -/۱۵۰ روپے

لڑکی:۔ گھریلو ۔۔

(۲) لڑکی کے لئے

لڑکی۔ بی۔اے پاس ہے۔

عمر:۔ ۲۲ سال

کراچی اور لاہور کے رشتے بہتر ہونگے

:۔ خط و کتابت :۔

رفاقت معرفت ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

دو نایاب کتابیں

(۱) پرویز صاحب کی معرکہ آرا تصنیف **معراج انسانیت** (یعنی سیرتِ نبی اکرمؐ) ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اب ہمیں اس کے صرف چار نسخے کہیں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ قیمت فی جلد، بیس روپے ہے۔

(۲) **انسان نے کیا سوچا** کا پہلا ایڈیشن خط نستعلیق میں چھپا تھا جو مدت ہوئی ختم ہو گیا تھا۔ اکثر احباب نے اسے طلب کیا لیکن ہمارے پاس اسکی کوئی جلد نہیں تھی۔ اب ہمیں اسکے پانچ نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ قیمت فی جلد بارہ روپے

جو فرمائشیں سب سے پہلے موصول ہونگی، صرف ان کی تعمیل ہو سکے گی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔

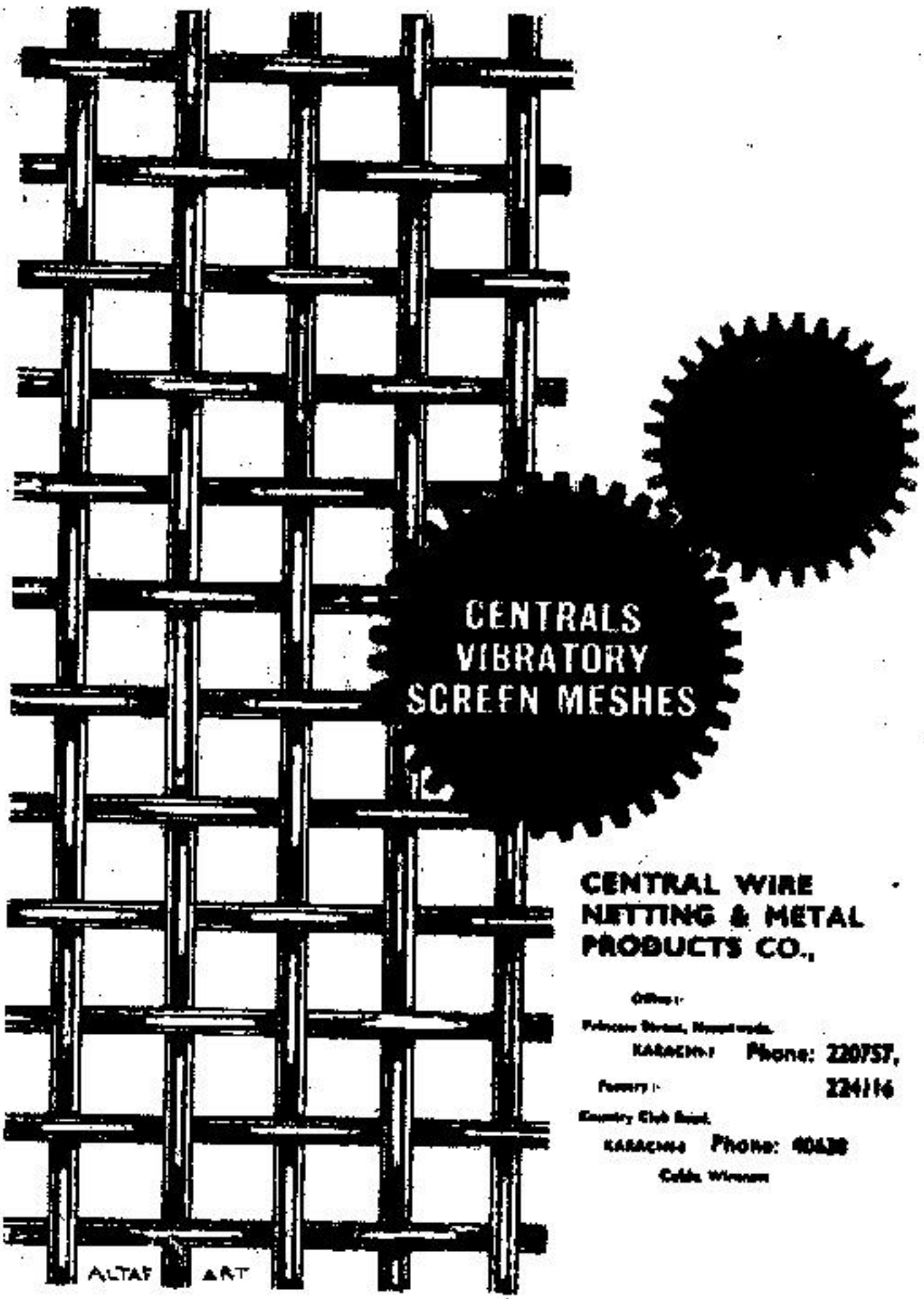

CENTRALS
VIBRATORY
SCREEN MESHES
CENTRAL WIRE
NETTING & METAL
PRODUCTS CO.,
Phone: 220757,
Phone:
ALTAF ART

رُویتِ ہلال کا "اطمینان بخش" انتظام

گذشتہ عید (بلکہ عیدین) کے موقعہ پر سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب نے حسب ذیل بیان دیا تھا جو جماعت اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' کی ۲۲ر جنوری کی اشاعت میں ٹائیٹل پر جلی حروف میں شائع ہوا ہے:

> ہمارے لئے یہ نہایت خوشی کی بات تھی کہ حکومت پاکستان نے ایک مسلمان حکومت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کی اور رویت ہلال کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہم تو خود چاہتے تھے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرے جو ایک مسلمان حکومت پر عاید ہوتے ہیں لیکن اس کام کے لئے اس نے جو انتظام کیا ہے وہ قابلِ اطمینان نہیں ہے اس وجہ سے پچھلے سال بھی عید میں گڑبڑ ہوئی تھی جس کا حکومت کو خود اعتراف کرنا پڑا۔ اب اس سال جو صورت پیش آئی ہے' اس نے رویتِ ہلال کے موجودہ سرکاری انتظام کو اس حد تک ناقابلِ اطمینان ثابت کر دیا ہے کہ آئندہ اس کے اعلانات پر اعتماد نہیں کیا جا سکے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اس طریقہ کو فوراً تبدیل کر دیا جائے۔

اس بیان میں مودودی صاحب نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ حکومت کو اپنا موجودہ انتظام بدلنا ہوگا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو جس طرح اس سال اس کا اعلان ناقابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے اور اس کی وجہ سے ملک میں گڑبڑ مچا دی گئی ہے' اسی طرح آئندہ بھی اس کے اعلانات پر اعتماد نہیں کیا جا سکے گا۔ اور اسی طرح گڑبڑ مچے گی ـــــ انتظام کو بدلنے کے معنی ہیں اُس انتظام کو اختیار کرنا جو مودودی صاحب تجویز کرتے ہیں۔

یہ "قابلِ اطمینان" انتظام کیا ہوگا اس کے متعلق مودودی صاحب نے ۱۹۶۱ء میں لکھا تھا۔

> پاکستان کے ہر ضلع میں دو عالم ایسے مقرر کئے جائیں جن کا اپنے علاقہ میں بھی اعتماد

ہو اور ان کے ضلع سے باہر بھی لوگ ان کو جانتے ہوں اور ان پر اعتماد رکھتے ہوں۔ اسی طرح ڈھاکہ، کراچی اور لاہور میں پانچ پانچ علماء کی ایک مجلس مقرر کر دی جائے جو عام طور پر ملک میں قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے اضلاع کے علماء کو یہ سہولت بہم پہنچائی جائے کہ اپنے شہر سے مذکورہ بالا تینوں مراکز میں سے کسی ایک مرکز پر وہ بذریعہ ٹیلیفون ہلال کے دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کی اطلاع رات کے نو بجے تک پہنچا دیں۔ ان تینوں مراکز کے علماء ان اطلاعات کی بنا پر اور خود اپنے شہر اور آس پاس کے علاقوں کی اطلاع کی بنا پر یہ فیصلہ کریں کہ چاند ہوا ہے یا نہیں۔ (ترجمان القرآن — اپریل ۱۹۶۱ء)

مودودی صاحب کے مجوزہ انتظام سے دو باتیں واضح ہیں۔

(۱) یہ انتظام ملک گیر ہونا چاہیئے، تاکہ سارے ملک (مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں) میں ایک دن عید ہو سکے — اور

(۲) ذریعۂ اطلاعات ٹیلیفون ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ اگر حکومت، مودودی صاحب کی تجویز کے مطابق علماء بھی مقرر کر دے اور انہیں ٹیلیفون کی سہولت بھی مہیا کر دے، تو کیا اس کے بعد گڑبڑ کے سب راستے بند ہو جائیں گے؟ جی نہیں! اگر ملک میں گڑبڑ مچانے کے امکانات ختم ہو جاتیں تو پھر یہ لوگ، دین کی خدمت "کس طرح سے کر سکیں گے؟ — دیکھیے! اس کے لئے مودودی صاحب نے ابھی سے کس طرح گنجائش رکھ لی ہے۔ عیدین ۱۲/۱۳ جنوری کو ہوئی تھیں انہوں نے ۱۸ جنوری کے اپنے درس قرآن و حدیث میں ایک سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ اس کی زندہ شہادت ہے۔ یہ سوال اور اس کا جواب، ایشیا کی ۲۲ جنوری کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

سوال:۔ کیا کبھی دورِ اول میں بھی مکے اور مدینے میں دو عیدیں ہوئی تھیں؟

جواب:۔ مکہ اور مدینہ میں اس ریڈیو سے سابقہ کب پیش آیا تھا۔ وہاں تو قاضی اور مفتی قابلِ اعتبار آدمیوں کی شہادت کے بعد، رویت ہلال کا فیصلہ کرتا تھا اور یہ شہادت ٹیلیفون پر نہیں بلکہ رُو در رُو ہوتی تھی۔ ٹیلیفون کی شہادت تو قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ یہ ضروری ہے کہ شہادت دینے والا جج کے سامنے موجود ہو تاکہ اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا بھی جائزہ لیا جا سکے۔

پھر یہ غلط فہمی جو پھیلائی جا رہی ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی عید ایک دن ہوتی

چاہیئے ۔ بالکم از کم ایک ملک میں عید کو ایک دن ہونا چاہیئے ۔ یہ شریعت کا ہرگز منشا نہیں ۔

شریعت اسلامی تو تمام زمانوں کے لیئے ہے ۔ آج سے سو سال پہلے کیا اس بات کا امکان تھا کہ پورے پنجاب میں بھی ایک دن عید ہو سکتی ۔ ریڈیو کے سبب اگرچہ یہ ممکن ہوا ہے لیکن اگر ریڈیو کو فیصلہ مان لیا جائے تو پھر ہر شخص کے پاس اس کی موجودگی دینی واجبات میں سے ہو جائے گی ۔

غور فرمایا آپ نے کہ خود اپنے تجویز کردہ انتظام کے بعد بھی گڑبڑ مچانے کی گنجائش کس طرح رکھی جا رہی ہے؟ اُن کا تجویز کردہ انتظام یہ تھا کہ :

(۱) سارے ملک میں ایسا انتظام کیا جائے جس سے عید ایک دن ہو سکے ۔ — اور

(۲) ٹیلیفون پر شہادت تسلیم کر لی جائے ۔

اور اب کہا یہ جا رہا ہے کہ :

(۱) شریعت کا یہ منشا ہی نہیں کہ سارے ملک میں ایک دن عید ہو — اور

(۲) ٹیلی فون کی شہادت ' قابلِ اعتماد قرار نہیں دی جا سکتی ۔

فرمایئے ! اگر حکومت مودودی صاحب کا تجویز کردہ انتظام بھی اختیار کر لے تو کیا اس کے بعد گڑبڑ مچانے کے " شرعی امکانات " ختم ہو جائینگے ؟

لیکن ذرا ٹھہریئے ! ایشیا کی جس اشاعت میں مودودی صاحب کا یہ درس شائع ہوا ہے ' اس میں ان کا ایک بیان بھی شائع ہوا ہے ۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ :

> یہ خبر یعنی ریڈیو کا اعلان ، سننے کے بعد میں نے مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں خود بھی ٹیلیفون کیئے اور مغربی پاکستان کے مختلف حصوں سے میرے پاس بھی مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہو گئے — کراچی ، نواب شاہ ، صادق آباد ، رحیم یار خان ، خان پور ، ملتان ، سرگودھا ، حافظ آباد ، گجرات ، گوجرانوالہ ، نارووال ، سیالکوٹ ، لالہ موسیٰ ، راولپنڈی — غرض مختلف مقامات پر علماء نے یہ رائے قائم کی کہ چاند نکلنے کا کوئی قابلِ اطمینان ثبوت ہم نہیں پہنچا ۔

یعنی اگر حکومت ' ٹیلیفون کی اطلاع پر اعتماد کر کے یہ اعلان کر دے کہ چاند ہو گیا ہے ' تو یہ اطلاع شرعاً ناقابلِ اعتماد سمجھی جائے گی ۔ لیکن اگر مودودی صاحب اسی ٹیلیفون کے ذریعے یہ اطلاع حاصل کریں کہ چاند نہیں ہوا ، تو یہ اطلاع شرعاً قابلِ اعتماد ہوگی ! غور فرمایا آپ نے کہ ان حضرات کے نزدیک " شرعاً قابلِ اعتماد "

کسے کہتے ہیں۔

رویت ہلال کے سلسلہ میں احتشام الحق صاحب کیرانوی[1] نے بھی ایک بیان دیا تھا جس میں کہا تھا۔

مولانا مفتی شفیع صاحب کا پرچہ میری جیب میں ہے جس میں انہوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ سرکاری رویت ہلال کمیٹی کے رکن فیضی صاحب سے ٹیلیفون پر ان کی گفتگو ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ مرکزی رویت ہلال کمیٹی نے نہ چاند دیکھا، نہ اسکے سامنے کوئی شہادت گذری۔ صرف باہر کے ٹیلیفون کی خبر پر اعلان کر دیا گیا جو شرعی نقطۂ نگاہ سے قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ (ایشیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۶۷ء)

جس طرح مودودی صاحب نے کہا تھا کہ حکومت کے اس قسم کے اعلانات آئندہ بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھے جائینگے اسی طرح احتشام الحق صاحب نے بھی اپنے بیان میں کہا ہے کہ :

ہم ملکی اور انتظامی مصلحتوں کے نام پر یا حکومت کے وقار کے نام پر دینِ اسلام کے تقاضوں کو کبھی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے اور ہمیشہ اختلاف رائے کے طور پر اس کا اظہار ہوتا رہے گا۔ (ایضاً)

اس سلسلہ میں مفتی محمد شفیع صاحب کا بیان بھی ملاحظہ فرمالیں۔ وہ بھی ایشیا کی اسی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم سے ٹیلیفون پر ملک کے طول و عرض سے اس قسم کے سوالات کئے جا رہے تھے کہ جن کے جواب میں متذکرۃ الصدر جواب ہی دیا جاتا رہا۔ تقریباً ساڑھے دس بجے فیضی صاحب سے جو رویت ہلال کمیٹی کے رکن ہیں، رابطہ قائم ہوا۔ فیضی صاحب نے میرے سوال کے جواب میں بتلایا کہ راولپنڈی میں بھی مطلع صاف ہے۔ یہاں چاند نہیں دیکھا گیا۔ اور کوئی شہادت بھی ہمارے سامنے پیش نہیں ہوئی۔ مگر اعلان اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ کوہاٹ کے مولانا امیر عالم صاحب نے ان کو ٹیلیفون پر مطلع کیا ہے کہ انہوں نے اور ان کے ساتھ دس گیارہ آدمیوں نے چاند دیکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اتنی بات آپکے فیصلۂ اعلان کے لئے کافی نہیں۔ براہِ کرم آپ خود کوہاٹ سے گواہوں کو بلا کر شہادت لے لیں یا

---

[1] یہ صاحب اپنے آپ کو تھانوی لکھتے ہیں حالانکہ یہ کیرانہ کے رہنے والے ہیں۔ اور ایشیا میں تو انکے نام کے ساتھ سید بھی لکھا ہوا ہے!

خود وہاں جاکر شہادت حاصل کرنے کا انتظام کریں اور پھر اپنے فیصلے کا اعلان کریں تاکہ اصولِ شرعیہ کے مطابق آپکا فیصلہ ایک شہادت کی بنیاد پر مستحکم ہو جائے اور ملک کے تمام علماء اسکو قبول کرلیں مگر اس موقعہ پر ٹیلیفون کٹ گیا ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ بعد میں اس تجویز پر کسطرح عمل کیا گیا۔

یعنی کوہاٹ کے ایک عالمِ دین (دس گیارہ ساتھیوں کی شہادت پر) راولپنڈی کے ایک عالمِ دین کو ٹیلیفون پر اطلاع دیتے ہیں اور مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ شہادت قابلِ تسلیم نہیں۔ راولپنڈی کے مفتی صاحب کو یا تو خود کوہاٹ جانا چاہیئے تھا اور یا کوہاٹ کے گواہوں کو بلاکر شہادت لینی چاہیئے تھی۔ تب شہادت قابلِ قبول ہوتی (بشرطیکہ وہ گواہ بھی شرعی اصول کے مطابق قابلِ اعتماد ہوتے۔)

فرمایئے! جو انتظام مودودی صاحب نے تجویز فرمایا تھا وہ مفتی صاحب کے نزدیک قابلِ قبول ہو سکتا تھا! آپ کہیں گے کہ مفتی صاحب کی تجویز ہی اختیار کرلی جائے! لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ جب تک ان کی تجویز عمل میں آئے گی اس وقت تک ان کا فتویٰ بدل نہ چکا ہوگا؟ یہ ہمارا قیاس نہیں حقیقت ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے کا ذکر ہے کہ جب لاؤڈ اسپیکر ملک میں نیا نیا آیا تو مفتی صاحب سے دریافت کیا گیا کہ شرعاً اس کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ تو انہوں نے اس کے جواب میں (دو سطروں کا) فتویٰ نہیں بلکہ ایک رسالہ لکھا۔ اس میں تحریر تھا کہ مجھے ذاتی طور پر علم نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر کس طرح کام کرتا ہے۔ میں نے جوبلی ہائی اسکول (آگرہ) کے ایک ہندو سائنس ماسٹر سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ (یقینی طور پر تو وہ بھی نہیں کہہ سکتے لیکن) اس سے جو آواز نکلتی ہے وہ متکلم کی اپنی آواز نہیں ہوتی۔ اس تحقیق کی بنا پر مفتی صاحب نے فتوے دے دیا کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شرعاً جائز نہیں۔ اور اب یہ حالت ہے کہ جب تک لاؤڈ اسپیکر سامنے نہ ہو مفتی صاحب وعظ نہیں کہتے! سوان حضرات کے فتووں کو بدلتے کون سی دیر لگتی ہے۔ آج ٹیلیفون پر شہادت شرعاً ناقابلِ قبول ہے، کل یہ قابلِ قبول ہو جائے گی۔

آخر میں یہ بھی دیکھتے جایئے کہ ایشیا کے اسی شمارہ میں جس میں یہ تمام بیانات شائع ہوئے ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی درج کی گئی ہے کہ ۔ صوموا لرویتہ و افطروا لرویتہ۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔ اس حدیث کی رُو سے شرعی حکم یہ ہوا کہ ہر مقام کے لوگ خود چاند دیکھ کر عید کریں۔ کسی دوسرے مقام پر چاند کا دیکھا جانا، ان کے لئے شرعی حجت نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کے تجویز کردہ نظام یا مفتی صاحب کی فیضی صاحب کو ہدایت (کہ وہ خود کوہاٹ جاکر رو در رو شہادت حاصل کریں) کی کوئی حیثیت بھی رہ جاتی ہے؟ اگر ہر شہر میں عید، خود چاند دیکھ کر منائی جائے گی تو اس سارے بکھیڑے کی ضرورت کیا ہے؟

یہ ہے رویتِ ہلال کے سلسلہ میں وہ اطمینان بخش انتظام جو ان حضرات کی طرف سے تجویز ہوا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان حالات میں حکومت کوئی انتظام بھی ایسا کر سکتی ہے جس کے بعد یہ حضرات شرعاً گڑبڑ نہ مچا سکیں؟ کس قدر سچ فرمایا تھا حکیم الامت نے کہ ؎

کارِ مُلّا — فی سبیل اللہ فساد!

جب تک (اور جس قوم میں) مُلّا موجود ہے، فساد مٹ ہی نہیں سکتا۔

رابطۂ باہمی۔ صفحہ ۵۶ سے آگے الغرض بزم کی اس پُرخلوص انتھک محنت و مسلسل جدوجہد کے صدقے میں بہت سے تعلیم یافتہ گھروں تک یا داز پہنچ رہی ہے اور فضا میں قرآنی نظریات کا چرچا دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باہمت رفقا کے مبارک ارادوں، اور سعی و استطاعت میں برکت عطا فرمائے۔

بزمِ لائلپور:- درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ حسبِ معمول جاری ہے۔ لٹریچر اور ماہنامہ طلوعِ اسلام کی تقسیم اور اشاعت کا کام معقول طریقہ پر ہو رہا ہے۔ طلوعِ اسلام میں شائع ہونے والے مضامین کی جاذبیت اور اس سلسلے کے پوسٹروں سے رسالہ زیادہ مقبول ہو رہا ہے اور متعلقہ لٹریچر کی مانگ توقع سے زیادہ ہو رہی ہے۔

بزمِ میانوالی:- بزم کے موجودہ نمائندہ محترم محمد شریف لون صاحب اور ان کے مخلص رفقا کے کار تحریکِ طلوعِ اسلام کی توسیع و اشاعت کیلئے غیر معمولی انہماک سے کوشاں ہیں۔ ان کے کام کا حلقۂ اثر میانوالی تک ہی محدود نہیں بلکہ دور دور تک ہے۔ حال ہی میں ان کی مساعی جمیلہ سے لاہوسی اور طلکوال میں نئی بزمہائے طلوعِ اسلام کی تشکیل کی جا رہی ہے جن کے نمائندگان علی الترتیب محترم ضیاء الدین و چوہدری فیض احمد صاحبان تجویز کئے گئے ہیں۔

بزمِ بریڈفورڈ انگلینڈ:- اس بزم کے اراکین جو مختلف مقامات میں اقامت رکھتے ہیں تحریک میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ دسمبر کے اواخر میں ایک خصوصی اجتماع بریڈفورڈ میں منعقد ہوا جس میں بہت سے احباب نے شرکت کی۔ اس موقعہ پر محترم پرویز صاحب کا ٹیپ شدہ خطاب آئیڈیل اسلام پیش کیا گیا جس سے سامعین نے بہت مفید اور پُر از معلومات پایا۔ اراکینِ بزم کے علاوہ اور لوگ بھی شریکِ محفل تھے۔ خطاب کے بعد بزم کی تازہ سرگرمیوں کی روئیداد پیش ہوئی اور یہ طے ہوا کہ رسالہ طلوعِ اسلام اور دیگر لٹریچر متعلقہ تحریک کی اشاعت کو بڑھایا جائے۔ بالاتفاق یہ تجویز منظور ہوئی کہ برطانیہ میں شائع ہونے والے ہفت روزہ اخبار "ایشیا" کے ذریعہ عوام کو مختلف مقامات سے بآسانی قرآنی فکر کا لٹریچر حاصل کرنے کی نشاندہی کیلئے اور اس مقصد کیلئے مندرجہ ذیل احباب کے نام و پتے نوٹ کئے گئے۔

(۱) عبدالرزاق و خواجہ محمد عارف صاحبان۔ پریسٹن۔ PRESTON (LANES)

(۲) خواجہ لال دین صاحب۔ مڈلز بارو۔ MIDDLES BROUGH (YORK) - (۳) مرزا اسلم بیگ صاحب۔ لیڈز۔ (LEEDS)

(۴) محمد سلیمان صاحب۔ برمنگھم (BIRMINGHAM) (۵) ایم۔ وائی۔ بٹ صاحب۔ آکسفورڈ (OXFORD)

ایک اور تجویز بھی منظور ہوئی جس کی رو سے ادارہ طلوعِ اسلام یا اسکے لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی درخواست پر (جو پرچہ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں) یہ بزم ایک سال کے لئے پرچہ طلوعِ اسلام مفت جاری کرا دے گی۔

ایسا کیوں ہے؟

(صدرِ محترم کی خصوصی توجہ کے لئے!)

شکریہ پرسشِ غم کا مگر اصرار نہ کر!
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو

ہمارے صدرِ محترم محمد ایوب خان نے، اسلام کے متعلق جب اور جہاں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ وہ دین کی اصل وحقیقت کو نہایت عمدگی سے سمجھتے ہیں اور اسکے مقصد وغایت پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ عسکری انقلاب کے بعد، مختلف مواقع پر ان کے بیانات اور مشرقِ وسطےٰ کے دورے کے سلسلہ میں ان کی بلیغ اور بصیرت افروز تقاریر (جنہیں طلوعِ اسلام وقتاً فوقتاً سامنے لاتا رہتا ہے) اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے ان کی وہ فکر انگیز تقریر آتی ہے جس سے انہوں نے حال ہی میں (کراچی میں) بین الاقوامی محفلِ قرأت کا افتتاح کیا تھا۔ اس میں انہوں نے فرمایا:

> قرآنِ کریم کی خوش الحانی سے قرأت ہمیشہ ایک فن (آرٹ) تصور کی جاتی رہی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرأت کے اصول خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں لیکن اسکی حیثیت "فن برائے فن" کی نہیں۔ نہ ہی اسے ایسا ہونا چاہیئے۔ یہ ایک بلند اور واضح مقصد کے حصول کا ذریعہ رہا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے کلام کو ایسے حسین اور جاذب انداز سے پیش کیا جائے کہ اس کی جاذبیت اور اثر انگیزی میں اضافہ ہو۔
>
> قرآن کریم کی اثر انگیزی داخلی اور خارجی دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ حسنِ قرأت اسکی خارجی اثر انگیزی کا موجب ہے۔ لیکن اگر حسنِ قرأت تھوڑے سے وقت کے لئے انسان کے ذوقِ سماعت کی تسکین کا سامان بن کر رہ جائے تو اس سے اس کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ذوقِ جمالیات کی تسکین کے ساتھ، قرآن کے مطالب ومعانی دل کی گہرائیوں میں اس طرح

اتر جائیں کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کی آرزو اور استعداد میں اضافہ ہو جاتے۔

اسلامی تاریخ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ جس طرح علم بلا عمل، اور عمل بلا علم ناقص اور ناتمام رہتا ہے، اسی طرح دین اور دنیا بھی ایک دوسرے سے الگ رہ کر ناقص و نامکمل رہتے ہیں۔ جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے اوجِ کمال پر تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت اسلام کی روح اور زمانے کے تقاضوں میں نہ کوئی تضاد تھا نہ تخالف۔ اُس وقت مذہب اور زندگی دو الگ الگ شعبے نہیں تھے۔ اس کے برعکس، اس وقت مذہب کا مقصد انسان کی زندگی کو حسین و سادہ و خوشگوار بنانا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ صورتِ حالات بدل گئی اور مذہب اور دنیا دو الگ الگ دائروں میں بٹ گئے۔ ان میں نہ صرف بُعد پیدا ہو گیا بلکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم مذہبی نقطۂ نگاہ سے اپنی ترقیوں کی بلندیوں کا اندازہ لگانا چاہیں تو ہمیں ماضی کیطرف لوٹنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم مادی ترقی کرنا چاہیں تو ہماری نگاہیں مستقبل کی طرف اٹھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی (سیکولر) طبقوں میں ہم آہنگی کے بجائے انتشار، تعاون کے بجائے تضاد، اور اعتماد کے بجائے عدم اعتماد پایا جاتا ہے۔

اگر یہی صورتِ حالات جاری رہی تو خدشہ ہے کہ کہیں زندگی اور مذہب کا رشتہ اور زیادہ کمزور نہ ہو جائے۔ آج دنیائے سائنس میں، ٹیکنالوجی اور ذہنِ انسانی کی صلاحیتیں بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ اگر مذہب نے وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کیا، تو (یاد رکھیئے!) ہماری مذہبی اور مادی زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو جائے گا جسے پُر ہی نہیں کیا جا سکے گا۔

ان حالات کے پیشِ نظر ہمارے مذہبی اور سیکولر ارباب علم کے سر پہ ایک عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے علم اور عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اسلام فی الواقع ایک ایسا مکمل دین ہے جو ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ ثبوت نہ تو ماضی کی درخشندہ روایات کو دہراتے رہنے سے بہم پہنچ سکے گا، اور نہ ہی مناظروں اور مباحثوں سے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے بنیادی تصورات کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد، علمی تحقیق اور فکری کاوش کو خاص اہمیت دیجائے تاکہ اس دور میں — جو سائنس کے انکشافات کا دور ہے — دل اور دماغ کے پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ دین کو قبول کیا جا سکے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ مذہب سے

یکسر برگشتہ ہو جائے گا اور (خدانکردہ) اسلام کا بھی وہی حشر ہوگا جو عیسائیت کا ہوا ہے۔
(پاکستان ٹائمز۔ ۳۱ جنوری)

آپ نے غور کیا کہ اس تقریر میں صدرِ محترم نے دین کی حقیقت اور اسلام کی غرض و غایت کو کیسے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اس خطرہ کو بھی کس شدتِ احساس کے ساتھ سامنے لائے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب کو زمانے کے تقاضوں سے اسی طرح الگ رکھا جس طرح اسے اب رکھا جا رہا ہے تو اس کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔

صدرِ محترم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے ایک لفظ سے بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہم انہیں انکی اس بالغ نگہی اور حق گوئی پر مستحقِ تبریک و تحسین قرار دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حالات کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

اس وقت ملک میں تعلیم کے دو مراکز ہیں۔ ایک مذہبی مدرسے اور دارالعلوم جن میں طالب علموں کو "دنیا" سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، اور دوسرے ہمارے اسکول اور کالج، جن میں طلباء دین سے نا آشنا رہتے ہیں۔ یہ ہیں تعلیم کے دو الگ الگ دوائر جن کا نتیجہ "دین اور دنیا" میں وہ بُعد و تضاد اور عدم اعتماد و انتشار ہے جس کی طرف صدرِ محترم نے باچشمِ نم اشارہ کیا ہے۔ اس بُعد اور ثنویت (DUALISM) کی ذمہ دار خود ہماری حکومت ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کی اس قدر حوصلہ افزائی اور امداد کرتی ہے کہ ان کا دائرہ اثر و نفوذ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارے اسکول اور کالج ہیں، جن کا نصابِ تعلیم ایسا ہے جس سے طالب علم دین کی غایت و حقیقت سے یکسر بیگانہ رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو کچھ انہیں اسلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے، دین سے جاذبیت پیدا ہونے کی بجائے، ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔ لہذا جس مہیب خطرہ کی طرف صدرِ محترم نے قوم کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس خطرہ کی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) خود حکومت ذمہ دار ہے۔

طلوعِ اسلام گذشتہ بیس برس سے، مسلسل چلا رہا ہے کہ ملک سے، تعلیم کی اس دوعملی کو ختم کیا جائے۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کو بند کر دیا جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ طالب علم، علومِ دنیاوی کے ساتھ ساتھ دین کی اصل و حقیقت سے بھی آشنا ہوتے چلے جائیں۔ اور اس طرح وہ اپنی ارضی زندگی کو سماوی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کر کے صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کر سکیں۔ دوسری طرف، قوم کو اس انتشار و خلفشار سے نجات مل جائے جو مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں سے

وبا کی طرح پھوٹ کر ملک کے امن کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے مسلسل و متواتر حکومت کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کرائی لیکن حکومت نے اس سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس خطرہ کے متعلق صدرِ محترم کو خدشہ ہے کہ وہ کہیں پیدا نہ ہو جائے، وہ پیدا ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں متنفر ہو رہا ہے اور مذہب پرست طبقہ وہ پوزیشن حاصل کئے جا رہا ہے جو ازمنۂ مظلمہ میں یورپ میں، احتساب (INQUISITION) کے علمبردار، پادریوں نے حاصل کر لی تھی اور جس کے بعد عیسائیت کو وہاں کی عملی زندگی سے دیس نکالا مل گیا تھا۔

ہم صدرِ محترم کی خدمت میں بصد ادب گزارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں فکرِ بلند اور قلبِ حساس کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہاں آپ کو مملکت کے وسیع ترین اختیارات بھی حاصل ہیں۔ آپ اگر ان تینوں چیزوں کو یکجا کر کے، تھوڑی سی ہمت کر لیں تو آپ یقیناً اسلام کو اس تاسف انگیز انجام سے بچا سکتے ہیں۔ جو انجام عیسائیت کا ہوا ہے۔ اس سے آپ کا نام اس دنیا میں بھی تاریخ کے اوراق پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ اور آخرت میں بھی اسلام آگے بڑھ کر، آپ پر تہنیت و تبریک کے پھول نچھاور کرے گا۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام یہاں سے بھی مل سکتے ہیں!

لاہور (۱) انٹرنیشنل بک سروس ۔۔ ۔۔ ۷۵ دی مال لاہور
(۲) کلاسیک بک سیلرز ۔۔ ۔۔ ۴۲ دی مال "
(۳) پیکیجز پبلشنگ ہاؤس ۔۔ ۴۴ دی مال "
(۴) کوآپریٹو بک شاپ ۔۔ ۔۔ ۷۰ دی مال "
(۵) لاہور بک ڈپو ۔۔ ۔۔ ۷۵ دی مال "
(۶) بک سنٹر ۔۔ ۔۔ چوک ریگل دی مال "
(۷) اردوستان ۔۔ ۔۔ چوک لکشمی "
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس ۔۔ ۔۔ ۱۹۲ انارکلی "
(۹) مکتبۂ پاکستان ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی "
(۱۰) گوشۂ ادب ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی "
(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال ۔۔ ۔۔ چوک انارکلی "
(۱۳) ماڈل بک سٹال ۔۔ بولٹن مارکیٹ دی مال "
(۱۴) ادبی بک سٹال ۔۔ ۔۔ گلبرگ ۲ ۔ لاہور
(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس ۔ المنار مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

لائلپور :- (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم۔ اے گلی ۷ بلاک ۲
نزد پرانی غلہ منڈی ۔ ریل بازار
(۲) شریف سنز، بک سیلرز، کارخانہ بازار ۔ لائلپور۔
(۳) حافظ محمد یونس صاحب ڈی ۷۶ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

کراچی :- (۱) محترم محمد اسلام صاحب ۱۰۰/۴ ۔ ۱ پرنسیس روڈ
نیو ٹاؤن ۔ کراچی ۵ ۔ فون (۲۳۵۸۰۰)
(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۱ بجے ۔ سندھ مدرسہ ہال ۔
بندر روڈ۔
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر ۔ وکٹوریہ روڈ ۔ صدر
(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز ۔ بندر روڈ کراچی۔
(۶) جنرل بک ڈپو ۔ فریئر روڈ ۔ نزد حبیب بنک کراچی۔
(۷) اقبال کتاب گھر ، سمرسٹ اسٹریٹ ۔ کراچی صدر۔

لیہ :- متصل ہوٹل ، نزد ریلوے اسٹیشن۔
ہر جمعہ کو بعد نماز عصر

انگلستان ۔ محترم رشید احمد بٹ صاحب
۱۹۰ سالٹ سٹریٹ ۔ بریڈ فورڈ ۸

سرگودھا ۔ حکیم حسن محمود نظامی ۔ نظامی دواخانہ
بلاک ۲ ۔ گلی مچھلی والی ۔ سرگودھا۔

میانوالی ۔ صوفی عبدالرحمٰن صاحب ۔ جلد ساز ۔
چوک فتح خان ۔ ملک مظفر سٹریٹ میانوالی

ملتان ۔ دانشکدہ جبین آگاہی ۔

باب المراسلات

مُلّا کی قوت

گذشتہ عید (بلکہ عیدین) کی افراتفری کے سلسلہ میں ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہم (اہل محلہ) نے مسجد کے امام سے کہا کہ ہم صبح عید کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ صبح عید نہیں ہوگی۔ ہم نے آپس میں کہا کہ جب ہم عید کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں روک کون سکتا ہے۔ اس مُلّا میں کون سی قوت ہے جو ہمیں ایسا نہ کرنے دے۔ صبح جب ہم عید کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں تو روزے سے ہوں اس لئے میں نمازِ عید کیسے پڑھا سکتا ہوں۔ ہم سب نمازی حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ بھاگ دوڑ کر ایک میدان میں پہنچے جہاں نماز کا اہتمام تھا۔ وہاں نماز پڑھی۔ اس وقت ہمیں اس کا احساس ہوا کہ مُلّا نے جو ہمیں دھمکی دی تھی کہ آپ کیسے عید کر لیں گے تو وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اس کے پاس واقعی اتنی قوت ہے کہ ہمارے سامنے روک بن کر کھڑا ہو جائے۔ اس کا کیا علاج ہے؟

طلوعِ اسلام۔

مُلّا کی یہ قوت خود ہمارے تساہل کا نتیجہ ہے۔ برہمن نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ مذہبی رسوم برہمن کے سوا کوئی اور ادا نہیں کرا سکتا۔ اسلام نے برہمنیت کا خاتمہ کر دیا لیکن ہم نے اسے ازسرِنو زندہ کر دیا۔ مُلّا کی یہ قوت خالص برہمنیت ہے۔ ذرا سوچئے کہ نماز پڑھنے اور پڑھانے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ بس اتنا ہی کہ نماز پڑھنے میں جو کچھ آپ آہستہ آہستہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھانے میں وہی کچھ ذرا بلند آواز سے کہنا ہوتا ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نماز پڑھ تو خود ہی لیتے ہیں لیکن نماز پڑھانے کے لئے مُلّا کے محتاج بن جاتے ہیں۔ جب آپ اہل محلہ مسجد میں عید کی نماز پڑھنے کے لئے جمع ہوئے تھے تو کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے میں سے کسی صاحب کو آگے کھڑا کر دیتے اور وہ ذرا بلند آواز سے وہی کچھ پڑھتا جاتا جو کچھ اس نے آہستہ آہستہ نماز پڑھنے کی صورت میں پڑھنا تھا؟ (یہی کیفیت ہر نماز بلکہ نمازِ جنازہ کی ہے) عیدین اور جمعہ کی نماز میں البتہ خطبہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ خطبہ کے معنی ہیں دوسروں سے باتیں کرنا۔ کیا آپ ہر روز ایک دوسرے سے نصیحت آمیز

باتیں نہیں کرتے ؟ یہی باتیں جب منبر پر کھڑے ہوکر) بلند آواز سے کی جائیں تو اسے خطبہ کہتے ہیں۔ اسمیں البتہ چند ماثورہ دعائیں (وغیرہ) ہوتی ہیں۔ سو بازار میں روپیہ آٹھ آنے کی ایک کتاب ملتی ہے جس میں یہ "عربی خطبے" درج ہوتے ہیں۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس کتاب کا نسخہ اپنے پاس رکھیں اور متعلقہ حصہ منبر پر کھڑے ہوکر پڑھ دیں! فرمائیے! اس میں آپ کو ملا کی محتاجی کہاں رہتی ہے۔ یہی کیفیت نکاح کی ہے۔ اول تو نکاح کے لئے کسی نکاح خواں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی لیکن اگر ایسا ضروری سمجھ بھی لیا جائے تو اس کے لئے خود چار الفاظ دہرا دینا کون سا مشکل کام ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ ملا میں فی نفسہٖ کوئی قوت نہیں ہوتی۔ یہ قوت خود آپ کی عطا کردہ ہے ؎

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خدا است
چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

اس عید کی افراتفری سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ لوگوں کو اس کا احساس ہوگیا کہ وہ ملا کے اسقدر محتاج ہو چکے ہیں کہ اگر وہ چاہے تو ان کی نمازیں بند کر سکتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ خود وہ کچھ کیجئے جس کے لئے آپ کو خواہ مخواہ ملا کی احتیاج ہوتی ہے۔ آپ اپنی نمازیں آپ پڑھائیے اور خطبے خود دیجئے۔ نکاح آپ کرائیے اور اذانیں خود دیجئے۔ ملا کی برہمنیت ختم ہو جائے گی اور اس طرح جب شجر ملت پر سے یہ اکاس بیل اتر جائے گی تو وہ خود بخود سرسبز ہونے لگے گا۔ ہم نے تو کبھی اعداد و شمار اکٹھے نہیں کئے۔ اگر اس کا شمار کر لیا جائے کہ ملک میں مسجدیں کتنی ہیں، تو آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں کہ ملک میں کتنی تعداد میں بہ ذریعہ مساجد) ایسے لوگ موجود ہیں جو خود ایک پائی کی بھی کمائی نہیں کرتے اور دوسروں کی کمائی پر پلتے ہیں۔ آپ نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ ملا آپ سے اجرت کس بات کی لیتا ہے؟ اس بات کی جو نماز اس نے آہستہ آواز سے ادا کرنی تھی اسے ذرا اونچی آواز سے ادا کرتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی حیثیت سے اس نے خود بھی نماز پڑھنی ہوتی ہے۔ اسی نماز کو وہ ذرا اونچی آواز سے (اور وہ بھی پانچ میں سے صرف تین نمازوں میں) پڑھ دیتا ہے۔ اور اس کے لئے آپ سے تنخواہ مانگتا ہے اور پھر دھمکی بھی دیتا ہے کہ میں نہ چاہوں تو تم نماز بھی نہیں پڑھ سکتے۔

ملک میں ایک تحریک چلنی چاہیئے کہ مساجد میں بچوں کے مدرسے قائم کئے جائیں (اس سے مسجد کی عمارت بھی صحیح مصرف میں آجائیگی اور اس کی حفاظت بھی ہو جائے گی۔ اگر سردست ایسا ممکن نہ ہو تو مسجد میں صرف ایک حافظ کی ضرورت ہوگی جو عمارت کی صفائی وغیرہ کرے اور وقت پر اذان دیدے۔ امام کی ضرورت نہیں ہوگی) نماز کے وقت نمازی اپنے میں کسی کو آگے کھڑا کر دیں کہ وہ اپنی نماز ذرا اونچی آواز سے ادا کرلے۔ اسی کو امامت کہتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ صرف اتنی سی تبدیلی سے آپ کے معاشرہ میں کتنی بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔

جنت ماں کے قدموں کے نیچے

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ملک فیروز خان نون نے اپنی کتاب (FROM MEMORY) میں۔ جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ لکھا ہے کہ

قرآنِ مقدس کا ارشاد ہے کہ۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ (ص ۱۲)

یعنے جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

کیا یہ قرآنِ مجید میں ہے؟

طلوعِ اسلام۔

یہ قرآن مجید میں کہیں نہیں۔ (یہ ایک حدیث بیان کی جاتی ہے) ملک صاحب کی پوزیشن بڑی ذمہ دارانہ ہے (وہ پاکستان کے وزیرِاعظم رہ چکے ہیں) انہیں چاہیئے تھا کہ ایک بات کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرنے سے پہلے اس کی تصدیق کر لیتے۔

اب جو یہ بات سامنے آگئی ہے تو اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ حدیث بھی رسول اللہ کی نہیں ہو سکتی۔ امومت (MOTHER-HOOD) کا یہ تصور اسلامی نہیں۔ ماتا پوجا۔ ہندوانہ تصور ہے۔ بھومی ماتا، بھارت ماتا، گنگا ماتا، گاؤ ماتا۔ اسی پرستانہ تصور کے مظاہر ہیں۔ قرآن کریم، ماں (باپ) کے متعلق اتنی ہی تاکید کرتا ہے کہ ان سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ اور بات نرمی سے کرو۔ کیونکہ بڑھاپے میں انسان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے۔ اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"، تو یہ بھی قرآنی تعلیم نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب تک بچہ اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے کے قابل نہیں ہوتا، اسے ماں باپ کی راہ نمائی میں چلنا چاہیئے لیکن جب وہ پختگی کی عمر کو پہنچ جائے تو اسے اپنے فیصلے، قرآنِ کریم کی روشنی میں، آپ کرنے چاہئیں۔ اگر دنیا اسی اصول پر چلتی کہ ہر آنے والی نسل کو جانے والی نسل کے فیصلوں کی اطاعت کرنی چاہیئے، تو انسانیت آج بھی وہیں ہوتی جہاں وہ آج سے چھ ہزار سال پہلے تھی۔ ایک زندہ قوم کی تو آرزو ہی یہی ہوتی ہے کہ:

جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر (اقبال)

ضمناً یہ بھی دیکھئے کہ ایک طرف ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ اور دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری سب سے پہلی ماں (اماں حوّا) نے شیطان کے فریب

میں آکر، ہمارے باپ (آدم) کو جنت سے نکلوا دیا تھا۔ پھر عورت کے متعلق یہ بھی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ہزار سیدھا کرنے کی کوشش کرو، وہ ٹوٹ تو جائیگی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے۔ جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی اور اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو عورت کو حکم دیا جاتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ (یہ بھی بقول ان لوگوں کے، رسول اللہ کی احادیث ہیں!) یعنی ان (وضعی) احادیث کی رُو سے ایک ہی گھر میں نقشہ یہ ہوگا کہ عورت کے ساتھ اس کا خاوند تو اس قسم کا ذلت آمیز سلوک کرے گا۔ اور وہی عورت، ماں کی حیثیت سے قابلِ پرستش بن جائے گی۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ایک عورت، بیوی کی منزل سے گزرے بغیر ماں کی پوزیشن حاصل کر ہی نہیں سکتی ــ آہ! بچاری عورت! اسے جنت کو اپنے پاؤں کے نیچے لانے کیلئے کسقدر ذلت آمیز "پلصراط" پر سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہ تمام تصورات غیر قرآنی ہیں۔ نہ عورت ناقص العقل اور ٹیڑھی پسلی کی پیداوار ہے اور نہ ہی اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ وہ (بھی مرد کی طرح) نوعِ انسانی کا ایک فرد ہے اور جو حیثیت مرد کی ہے وہی اس کی ہے۔ میاں بیوی کا باہمی رشتہ رفاقت اور مودت کا ہے۔ اور اولاد کا فریضہ یہ ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو ان سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔ باقی رہا احترام ــ سو وہ ماں ہو یا باپ، خاوند ہو یا بیوی ــ احترام تو اسی کا دل سے ابھرے گا جس کا کردار بلند ہوگا۔ اور جو اپنے حسنِ معاملات سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنالے گا۔ اگر ماں باپ، اپنی اولاد سے عزت کرانا چاہتے ہیں تو انہیں پہلے اپنے کردار سے واجب العزت بننا چاہیئے۔ بچوں کے دل میں سطحی (غلط) عقائد ٹھونس کر ان سے حقیقی احترام کی توقع کرنا، پیتل کے زیور پر سونے کا ملمع چڑھانا ہے۔ اس قسم کی ملمع کاری، عقل و شعور کی ایک آنچ کی بھی تاب نہیں لا سکتی۔ ہم یہ شکایت تو عام کرتے ہیں کہ آج کل کی اولاد گستاخ ہو جاتی ہے لیکن اسے کبھی نہیں سوچتے کہ اس کی وجہ یہی تو نہیں کہ ہم اپنی سیرت کے اعتبار سے واجب الاحترام نہیں رہے۔ یاد رکھیئے! بچے خواہ زبان سے کچھ نہ کہیں۔ ان کی نگاہ بڑی تیز اور قلب بڑا اخاذ ہوتا ہے۔ وہ آپ کی ایک ایک حرکت کو بڑی گہری نظروں سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ آپ اپنی ان حرکات سے بنتے ہیں، اسی قسم کا آپ کے متعلق ان کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اور اس کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اولاد کے کیریکٹر پر بھی گھر کے ماحول (بالخصوص ماں کی تربیت) کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ قوموں کی تشکیل جھولا جھولانے والے ہاتھوں سے ہوتی ہے، تو وہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

گھر بیٹھے دیکھئے!

اب تک پانچ روپے اور دس روپے والے بونڈز کے انعامات کی فہرست گزٹ آف پاکستان، اخباروں، پوسٹر اور کتابچے کی صورت میں شائع ہوتی رہی ہے۔
ان کے علاوہ اب انعامات کی فہرست ہر ماہ "نیشنل سیونگز نیوز" میں بھی شائع ہوتی ہے۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جسے سنٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز، حکومت پاکستان، جاری کرتا ہے۔ سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ۔

آپ "نیشنل سیونگز نیوز" تمام منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے خرید سکتے ہیں یا سنٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز کو ایک روپیہ کا پوسٹل آرڈر بھیج کر ایک سال تک گھر بیٹھے حاصل کر سکتے ہیں۔ بھیجنے سے پہلے پوسٹل آرڈر پر کراس ضرور کر دیجئے۔ بھیجنے کا پتہ: سنٹرل ڈائریکٹریٹ آف نیشنل سیونگز۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۲۔ کراچی ۱

انعامی بونڈ۔ ملک کی ترقی اور حفاظت کے لئے

نیشنل سیونگز نیوز

PRESTIGE DTP 102/2

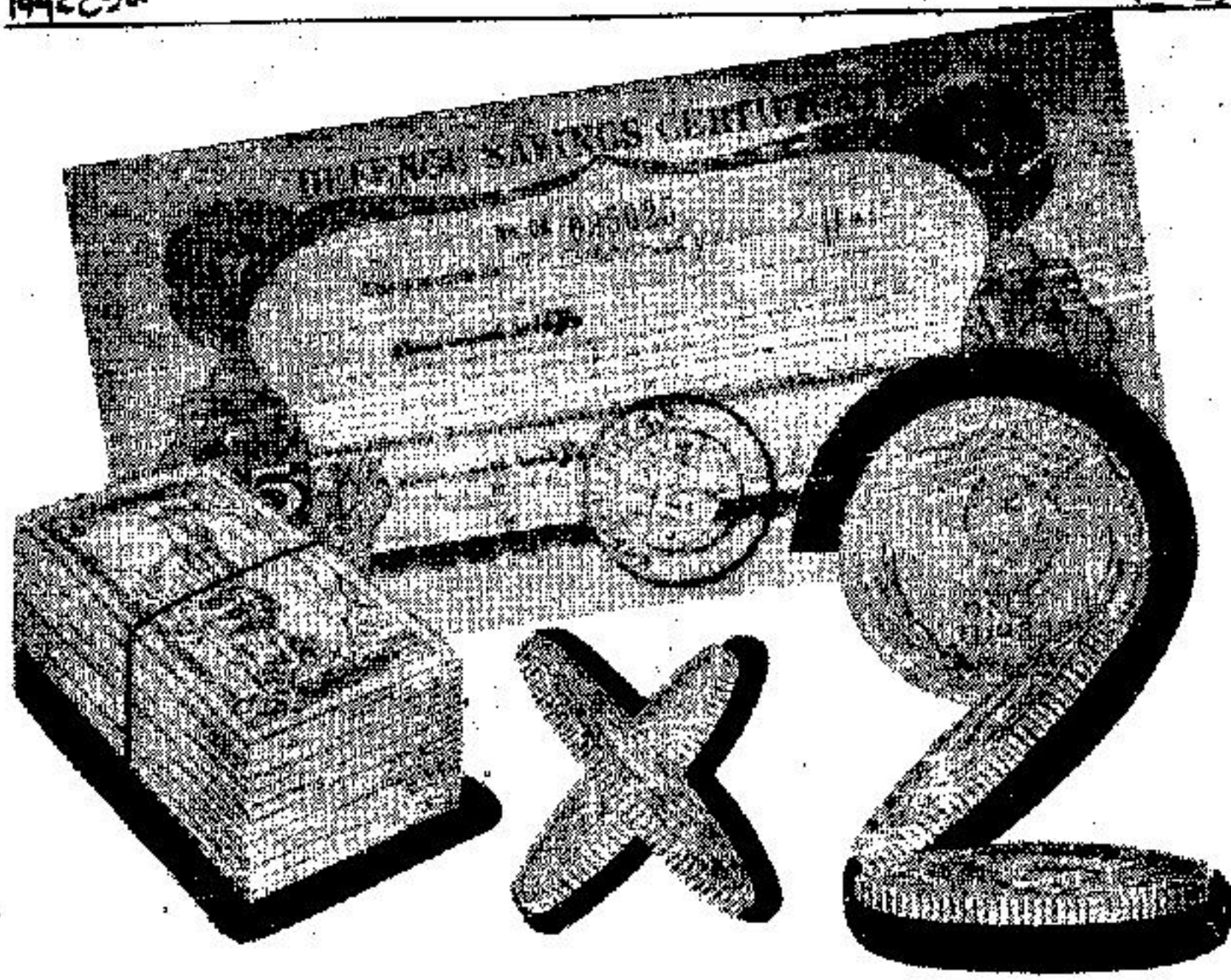

اپنے سرمایہ کو دُگنا کیجئے

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ میں لگائی ہوئی رقم دس سال میں تقریباً دُگنی ہوجاتی ہے

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ پر آپ کو سب سے زیادہ منافع ملتا ہے۔ بونس اس کے علاوہ ہے۔ ٹیکس کی رعایت مزید برآں۔ ۵ سال تک سیونگ سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھنے پر آپ ۹ فیصد منافع کے حقدار ہوجاتے ہیں۔ اور مزید سال کے بعد منافع ۸ فیصد ہوجاتا ہے۔ یعنی ۶ فیصد منافع اور ۲ فیصد بونس۔ اس طرح صرف دس سال بعد آپ کے سو روپے ۱۸۰ روپے بن جاتے ہیں۔

منافع اور بونس دونوں پر ٹیکس نہیں لگتا اور آپ کی لگائی ہوئی ابتدائی رقم پر بھی ٹیکس کی رعایت ملتی ہے۔ یعنی اتنی رقم نکالنے کے بعد آپ کی آمدنی پر ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے۔

انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ ۲۵ ہزار روپے تک کے سرٹیفکیٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ مشترکہ طور پر یہ حد ۵۰ ہزار روپے ہے۔ ادارے اس سے کہیں زیادہ رقم لگا سکتے ہیں۔ پراویڈنٹ فنڈ سے رقم لگانے کی کوئی حد نہیں۔ ضابطہ کے مطابق نامزدگی کی بھی اجازت ہے۔

ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

۵۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپے، ۵۰۰۰ روپے، ۱۰۰۰۰ روپے، ۵۰۰۰۰ روپے، ۱۰۰۰۰۰ روپے اور ۵۰۰۰۰۰ روپے کی مالیتوں میں
اسٹیٹ بینک آف پاکستان، منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے خریدے جاسکتے ہیں

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) چیپ ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔
جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔
جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لے کر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان جو یوں کہیئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لے کر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں واقعات کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

Regd. L. No. 7243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے
اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا
ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں
ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے
ہیں۔ اسے کوسئے نہیں یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح
صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور
بانکا پن لئے ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی
جلد: آٹھ روپے، دوسری و تیسری جلد
(چھ روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت
کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے
فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں
نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے
مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔
عمدہ سفید کاغذ مجلد بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور
واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے
قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت
کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین
کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو
پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی
تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد
بارہ روپے بعکس ہیٹ چھاپ بیٹھیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ
کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی
خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف
گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں
عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت
کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ اسلام کے مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ اسلام کے
بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی سیاسی
نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد
کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا
صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے
حسب ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵/بی۔ گلبرگ — لاہور